رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۰

جلد ۵۸ ، عدد ۵

اگست ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندا ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

عورت اسلامی معاشرہ میں

(مولانا سید جلال الدین انصر عمری)

- اسلام کے نظام معاشرہ کی مکمل تصویر
- اسلام اور دوسری تہذیبوں میں عورت کا مقام
- اسلامی معاشرہ کی بنیادیں اور اس کی امتیازی خصوصیات
- اسلام میں عورت کا صحیح مقام اور دائرۂ کار
- اسلام اور دوسری تہذیبوں کا تقابلی مطالعہ
- اپنے موضوع پر ایک بلند پایہ، تحقیقی اور نادر کتاب
- معاشرہ کو صحیح اسلامی خطوط پر استوار کرنے کے لیے ایک ضروری کتاب

عمدہ کتابت وطباعت — خوبصورت جلد — صفحات ۴۶۴

قیمت اعلیٰ ایڈیشن — ۶ روپے

سستا ایڈیشن — ۳٫۷۵ "

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۱ ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۸	اگست سنہ ۱۹۶۲ء	عدد ۵

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

قریب قریب پینتالیس ماہ کے بعد ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ ہم اس کے دین کی سربلندی کے لیے پھر ایک بار منظم ہو کر جدوجہد کریں۔ اس کرم نوازی کے لیے ہم اُس منعمِ حقیقی کا جس قدر شکر بجالائیں اسی قدر کم ہے:

رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ، أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ۔

اس وقت جبکہ جماعتِ اسلامی کی تشکیلِ جدید ہو رہی ہے ہم یہ چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ پھر اس کے مقصد اور نصب العین کی وضاحت کر دیں تاکہ اس جماعت کی اصل حقیقت نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

ہماری اس ساری جدوجہد کا مقصد صرف ایک ہی ہے کہ ہم خداوند تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار بندے بن جائیں اور اُس کی رضا حاصل کریں۔ ہمارا کعبۂ مقصود آخرت کی فلاح و کامرانی ہے۔ لیکن چونکہ جو راستہ ہمیں آخرت تک لے جانے والا ہے وہ دنیا ہی کی پُرپیچ وادیوں سے گزر کر جاتا ہے اس لیے ہمیں اللہ تعالیٰ نے اس دنیوی زندگی کے لیے جو احکام اپنے ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ عطا فرمائے ہیں اُن کی غیر مشروط اور مخلصانہ پابندی ہی میں ہم اپنی اور پوری نوعِ بشری کی نجات سمجھتے ہیں۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ اللہ کے بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا کو تنگی سے نجات دلا کر وسعت و کشائش

کی راہ دکھائیں ظلم و جور سے بچاکر عدل و انصاف کی فضا میں لائیں۔ بنی آدم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں ان کے درمیان ہم محبت اور اخوت کے رشتے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری نظر میں انسانوں کے درمیان شریف و کمین کی تقسیم صحیح نہیں۔ ہم انسانوں کی خود ساختہ اونچ نیچ کے بھی قائل نہیں ہیں۔ ہم تمام آدمیوں کو ایک ہی اصل کی شاخیں سمجھتے ہیں اور سب کے ساتھ ہمدردی اور بھلائی کا برتاؤ کرنا چاہتے ہیں۔ ملک گیری ہمارا مقصد نہیں ہے۔

یہ نصب العین چونکہ محض ایک خوش کن فلسفہ نہیں بلکہ ایک نظامِ فکر و عمل ہے اس لیے بحیثیتِ مسلمان ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم اس مقصد کے حصول کے لیے عملی جد و جہد کریں۔ اس مقصد کے ساتھ ہماری مخلصانہ وابستگی کا یہی ایک واحد معیار ہے۔ ہماری جد و جہد کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے آپ کو نفس کی بندگی سے آزاد کریں، پھر اس نفس پرستی کی وجہ سے ہم نے غیر اللہ کے ساتھ عبودیت کا جو رشتہ اُستوار کر رکھا ہے اُسے یکسر منقطع کر دیں اور اپنی جملہ خود مختاریوں سے دستبردار ہو کر صرف خدائے واحد کی غلامی کا جُوا اپنی گردنوں میں پہن لیں۔

اسلام کا براہِ راست مخاطب فرد ہے۔ اور آخرت میں ایک فرد ہی کی حیثیت سے ہم سے ہمارے اعمال کے بارے میں باز پرس کی جائے گی لیکن چونکہ اس دنیا میں ہمیں ایک فرد کی حیثیت سے رکھا نہیں گیا بلکہ لاتعداد رشتوں میں باندھ کر اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس لیے دینی تقاضوں کے تحت ہم اس بات کے لیے مجبور ہیں کہ ایک طرف خود احکامِ الٰہی کے پابند ہوں اور پھر انفرادیت کے دائرہ سے نکل کر اپنے گرد و پیش میں اسلامی تعلیمات کے مطابق اصلاحِ حال کی کوشش کریں اور اس طرح اپنے دائرہ کار کو یہاں تک وسیع کر دیں کہ پوری نوعِ بشری اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرے اور اس کرہ

اسی پر اللہ کے دین کے علاوہ کسی دین کا تسلط باقی نہ رہے۔ جس طرح معاشرے کی اصلاح افراد کی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح افراد بھی اللہ کے دین کی اس کے سارے لوازمات کے ساتھ صرف اسی وقت پوری طرح پابندی کر سکتے ہیں جب سوسائٹی نے بحیثیت مجموعی دین کی بالادستی قبول کر لی ہو اور ان سارے موانع کو راستہ سے ہٹا دیا ہو جو اطاعتِ خداوندی کی راہ میں مزاحم ہوتے ہیں۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ انفرادی طور پر خواہ آپ کتنے ہی نیک اور خدا ترس ہوں لیکن آپ جب تک اس نیکی اور خدا ترسی کو پوری سوسائٹی میں پھیلانے کی کوشش نہ کریں گے تو آپ کو قدم قدم پر مشکلات پیش آئیں گی اور آپ بہت سے ایسے کام کرنے پر مجبور ہوں گے جنھیں آپ دین کے تقاضوں کے سراسر منافی سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے آپ سخت جان ہوں اور اس تصادم کو برداشت کر لیں لیکن معاشرہ کے عام افراد اتنے سخت جان نہیں ہوتے۔ وہ جلد ہی جاہلیت کے ساتھ مصالحت پر آمادہ ہو جاتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آپ پر عرصۂ حیات تنگ ہونا شروع ہوتا ہے۔ آپ ذرا اپنے محلوں پر نگاہ دوڑائیں اور دیکھیں کہ نیک اور شریف خاندانوں کے اندر آج جو نوخیز نسل پرورش پا رہی ہے وہ نیکی اور شرافت کے اعتبار سے اپنے والدین کے کتنی برعکس ہے۔ والدین بیچارے اس نسل کی پوری کوشش کے ساتھ حفاظت اور پاسبانی کرتے ہیں، اسے غیر اسلامی اثرات سے بچانے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرتے ہیں لیکن غیر اسلامی تصورات کا ایک ہی ریلا آتا ہے اور اسے والدین کی نیک تمناؤں اور مقدس آرزوؤں کے علی الرغم بہا کر لے جاتا ہے اور یہ بیچارے منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ ماحول کی قوت کا مقابلہ انفرادی کوشش سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ اجتماعی جدوجہد ہی سے کیا جا سکتا ہے ہم جو بار بار اجتماعی زندگی کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس سے خدانخواستہ ہماری مراد یہ نہیں کہ انفرادی نیکی، پرہیزگاری اور تقویٰ کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور

... ایک ... کی اصلاح کو یکسر نظر انداز کر کے محض حکومت کے پیچھے پڑے رہتے ہیں ہم اسے زیادہ ... دین کے ساتھ کوئی اور خیانت کرنے والا نہ ہوگا۔ اگر ہمارے پیشِ نظر یہ ... ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا اصل ... مقصود رضائے الٰہی ہے اور اس کے حصول کے لیے ایک ایک فرد کو اپنی صلاحیت اور بصیرت کے مطابق کوشش کرنی چاہیے لیکن چونکہ اجتماعی بگاڑ اس کوشش کی راہ میں حائل ہوتا ہے اس لیے اُسے اجتماعی نیکی سے بدلنے کی ضرورت ہے تاکہ معاشرہ کی قوت سوسائٹی میں ممد و معاون ثابت ہو اور اس کے ذریعہ برائی کا استیصال کیا جاسکے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو جماعت اسلامی جس کا نصب العین صرف اعلائے کلمۃ الحق ہے نہ اُن معنوں میں ایک مذہبی جماعت ہے جن معنوں میں کہ یہ لفظ مغرب میں عام طور پر بولا جاتا ہے اور نہ اُن معنوں میں ایک سیاسی تحریک ہے جن معنوں میں یہ لفظ ہمارے ہاں رائج ہے۔ یہ اوّل تا آخر ایک دینی جماعت ہے۔ دین ہی اس کی اساس، اس کا مبداء اور جوہرِ حیات ہے۔ اس کا سیاست سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ خود اسلام کا ہے۔ ہمارے نزدیک سیاست نہ تو کوئی شجرِ ممنوعہ ہے کہ اس سے مکمل اجتناب برتیں اور نہ ہی ہماری غایت الغایات کہ ہم اپنی ساری توجہ اس کی طرف مرکوز کر دیں اور اسلامی تعلیمات کے باقی شعبوں سے یکسر غافل ہو جائیں۔ سیاسی اقتدار ہماری منزلِ مقصود نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ ہمارے نزدیک اُس شخص یا گروہ سے زیادہ کوئی ظالم نہیں ہو سکتا جسے جب اقتدار حاصل ہوتا ہے تو وہ لوگوں پر اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جماتا ہے، ان پر اپنی یا اپنے دھڑے کی بالادستی قائم کرتا ہے یا اُن میں اپنی نسل اور قوم کی خدائی کا سکہ چلاتا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ان شر انگیز اور مفسدانہ خیالات کے لیے پناہ مانگتے ہیں اور اُس کے حضور میں دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ان سے محفوظ و مامون رکھے۔

سیاسی میدان میں ہماری جدوجہد کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ ہم حیاتِ انسانی کے

باقی شعبوں کی طرح حکومت کو بھی قانونِ الٰہی کا پابند بنانا چاہتے ہیں اور اس بات کا عزم بالجزم رکھتے ہیں کہ اس کی غیر معمولی قوت و طاقت جو غیر اسلامی افکار و تصورات کی نشر و اشاعت میں بے دریغ صرف ہو رہی ہے اسے ہم اسلامی نظامِ حیات کے نفاذ میں استعمال کریں۔ یہ ایک بالکل سیدھی سی بات ہے جس میں ہمیں کوئی الجھن نظر نہیں آتی۔ حکومت مال و متاع کی طرح ایک قوت ہے اگر اسے شراب پینے اور پلانے، فحاشی اور اسی قبیل کی دوسری برائیاں پھیلانے میں صرف کیا جا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ قوت غریبوں اور ناداروں اور مظلوموں کی دستگیری اور دادرسی کرنے میں، کمزوروں کو سہارا دینے میں، اور باحیا لوگوں کو آبرو باختہ لوگوں کی دستبرد سے بچانے میں صرف نہ کیا جاتے —— آخر کیا وجہ ہے کہ ظلم و استبداد یہاں دندناتا پھر رہا ہے لیکن کوئی نہیں جو اس پر قدغن لگاتے اور اسے یہاں سے ختم کرنے کی کوشش کرے۔ کتنے بدنصیب ماں باپ بچوں کی جدائی میں زندہ درگور ہیں اور انہوں نے اُن کے فراق میں رو رو کر اپنی بصارت تک کھو دی ہے لیکن اُن کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ جو اقتدار ننھی منھی اور معصوم جانوں کی حفاظت اور پاسبانی کرنے کی بجائے آرٹ کلبوں کی تشکیل میں منہمک ہو اور جس کی قوتیں منکرات پھیلانے میں صرف کی جا رہی ہوں اُسے اگر جھنجھوڑنا، اس کے فرائض یاد دلانا، اور اگر وہ خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہو تو اُسے ہٹا کر کسی نیک، خدا ترس اور حساس قیادت کو اقتدار کے تخت پر متمکن کرنا "سیاست" ہے تو پھر ہم واقعی اس "جرم" کے مرتکب ہیں اور ہم اس سے برأت کا اعلان کرنے کی بجائے اس نعمتِ خداوندی پر مالکِ حقیقی کے شکر گزار ہیں کہ اُس نے ہمیں جباروں اور قہاروں کے سامنے سخت نامساعد حالات میں کلمۂ حق کہنے کی توفیق دی۔

ہمارا یہ "سیاسی شغف" بفضلِ ایزدی کسی ذاتی لالچ کا نتیجہ نہیں بلکہ ہمارے دین اور ایمان کا تقاضا ہے۔ ہمارے خالق نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں جب تک کہ اللہ کا دین سارے ادیان پر غالب نہ ہو جاتے ہمیں ہمارے ہادیٔ برحق نے یہ تعلیم دی ہے

کہ ہم جب کسی منکر کو دیکھیں تو اُسے قوت کے ساتھ روکنے کی کوشش کریں اور اگر اس چیز کی ہمت ہم میں ناپید ہو تو ہم زبان کے ساتھ اُس کی مذمت کریں اور اگر یہ بھی نہ کر سکیں تو کم از کم اُسے دل و جان سے تو بُرا سمجھیں۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ کیونکہ ممکن ہے کہ ہمارے سامنے جور و جفا کے لرزہ خیز مناظر آئیں، عفت مآب بہو بیٹیوں کی عزت و آبرو پر حملے کیے جائیں، قتل و غارت کا بازار گرم ہو، غریب روٹی کے ایک لقمہ کے لیے ترستے رہیں اور ان کی محنت و مشقت پر ایک بالکل مختصر سا طبقہ دادِ عیش دیتا رہے اور ہم یہ سارے روح فرسا واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود صرف اس لیے خاموش رہیں کہ ہمارے دامنِ صدق و صفا پر سیاست کے چھینٹے نہ پڑنے پائیں۔ اس قسم کی عافیت کوشی ہم اسلام کے منافی سمجھتے ہیں۔ ہمیں قیامت کے روز گونگے شیطان کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا اگر ہم ان پُر آشوب حالات میں مہر بلب رہیں اور قوت کے ان سرچشموں کو اپنے وسائل کی حد تک خدا ترس لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل کرنے کی کوشش نہ کریں جن سے محض ہماری غفلت کی بنا پر جبر و استبداد فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اگر یہ طاقت کفر کی ترویج و اشاعت میں خرچ ہو سکتی ہے تو یہ اسلام کی سربلندی کے لیے کیونکر صرف نہیں ہو سکتی۔

حکومت و ریاست یوں تو شروع ہی سے قوت و طاقت کا مظہر رہی ہے اور عوام و خواص اَلنَّاسُ عَلٰی دِینِ مُلُوکِہِم کے رنگا رنگ مظاہر دیکھتے رہے ہیں لیکن دورِ جدید میں اقتدار کی اثر آفرینی نہایت کھل کر سامنے آگئی ہے۔ سائنس کی حیرت انگیز ایجادات کی وجہ سے زمان و مکان پر انسان کا کافی حد تک تسلط قائم ہو چکا ہے اور زندگی کے مختلف گوشے سمٹ کر ایک دوسرے کے اتنے قریب آگئے ہیں کہ کسی گوشے کو بھی اقتدار کی دستبرد سے بچایا نہیں جا سکتا۔ پہلے بھی جس نظریہ کو حکومت کی نصرت و تائید حاصل ہوتی تھی وہ بڑی تیزی کے ساتھ عوام میں اثر و نفوذ حاصل کر لیتا تھا لیکن ہمارے اس عہد میں ریاست کا دائرہ کار غیر معمولی حد تک وسیع ہو گیا ہے

اور اس کی قوت وطاقت میں بھی زبردست اضافہ ہوا ہے۔ اس بنا پر اقتدار کو دین کا خادم بنائے بغیر اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد اپنے اندر یقیناً ثواب اور جزا کے بہت سے پہلو رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر کی ہر طرح مستحق ہے لیکن اس میں حکمت کا وہ عنصر غائب ہے جسے مومن کی میراث کہا گیا ہے۔ یہ اسی طرح کی کوشش ہو گی کہ کوئی مومن صادق کفار کے مقابلے میں جو لڑائی کے جدید ترین اسلحہ سے پوری طرح مسلح ہیں تیر و تفنگ لے کر صف آرا ہو جاتے۔ ہو سکتا ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت اُسے کامیاب و کامران کر دے لیکن اس کوشش کو بہر حال کوئی حکیمانہ کوشش نہیں کہا جا سکتا۔ اخلاص اپنی جگہ بڑی ہی قابلِ قدر چیز ہے اور یہ بسا اوقات بہت سے اسباب و وسائل کے مقابلے میں زیادہ وزنی ثابت ہوتا ہے لیکن اگر اسی اخلاص، اسی خداترسی اور اسی نیکی کے ساتھ حکمت کا جزو بھی شامل کر دیا جاتے تو اس سے بہتر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے اس حکمت کو نظر انداز کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اسے استعمال کرنے کی تلقین کی ہے۔

بات بلاشبہ کچھ تلخ ہے، لیکن اگر تلخ نوائی معاف ہو تو ہم یہ عرض کریں گے کہ مسلم قوم کے ساتھ اس سے بڑی بے وفائی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس غریب قوم سے اس کے گاڑھے پسینے کی کمائی مختلف حیلوں اور بہانوں سے چھین کر خزانے بھرے جائیں اور پھر ان خزانوں کو ایسے کاموں پر صرف کیا جائے جو اُس کے دین و ایمان کو غارت کرنے والے ہیں۔ ان بدنصیب لوگوں کے سروں پر اپنے اقتدار کا تخت بچھایا جائے اور پھر اس پر متمکن ہو کر انہیں اُن کی خواہش کے برعکس لاٹھی کے زور سے اُن راہوں کی طرف ہانکنے کی مذموم کوشش کی جاتے جو انہیں فوز و فلاح سے ہمکنار کرنے کی بجاتے تباہی و بربادی کی طرف لے جانے والی ہیں۔ اس جمہوری دور میں یہ ظلم و زیادتی مسلمان ملکوں میں عام دکھائی دیتی ہے۔ ان بدنصیب ممالک میں سے کوئی ملک بھی ایسا نہیں جہاں اقتدار عوام کی

خواہشات اور تمناؤں کا مظہر ہو۔ مسلمانوں کی اسلام کے ساتھ وابستگی اور محبت بلاشبہ کسی حد تک کم ہوگئی ہے لیکن ہمارا احساس یہ ہے کہ وہ دین کے بارے میں ابھی اتنے بے حس نہیں ہوتے کہ انہیں اپنی دولت کو شراب خوری اور اس نوعیت کی دوسری اخلاق سوز سرگرمیوں پر صرف ہوتے دیکھ کر کسی قسم کی تکلیف محسوس نہ ہوتی ہو۔ وہ یقیناً ان اخلاق باختہ سرگرمیوں سے نالاں ہیں لیکن ان کے اندر اتنی جرأت نہیں ہے کہ وہ اقتدار کو انہیں ختم کرنے پر مجبور کر سکیں۔ دنیاوی مصلحتوں نے انہیں عافیت کوش بنا دیا ہے۔ مسلمان ممالک میں مغرب پرست حکام اور اسلام پسند عوام کے درمیان جو کشمکش گزشتہ ایک صدی سے جاری ہے وہ اسی شدید بے چینی کی غمازی کرتی ہے۔ ایک طرف ایک نہایت ہی مختصر سا طبقہ پولیس اور فوج کے بل بوتے پر ملک کے پورے وسائل پر قابض ہے اور وہ ان وسائل کو اسلام کے خلاف استعمال کرنے میں پیہم مصروف ہے اور دوسری طرف بے بس عوام جن کی حیثیت اس طبقہ نے بھیڑوں کے گلہ کی سی بنا دی ہے، اپنے اس قومی زیاں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں لیکن خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے ہیں۔ آخر غور کیجیے اُن کی اس بے بسی کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ غیر اسلامی طاقتیں منظم ہیں اور اقتدار کے تخت پر قابض ہیں اور ان کے برعکس ان ممالک کی عظیم اکثریت، جس کے دل میں ابھی تک اسلام کا درد موجود ہے انسانوں کی محض ایک بھیڑ بن کر رہ گئی ہے جسے اقتدار کی قوت جس طرح چاہتی ہے میکانکی طور پر ہانک کر لے جاتی ہے۔

ہمارے طریق کار سے کسی شخص کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ہماری عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ جس انسان کو اللہ تعالیٰ نے سوچنے سمجھنے کی معمولی صلاحیت بھی دی ہے، یا جس کے پہلو میں پتھر نہیں بلکہ دل موجود ہے وہ مسلمان ممالک میں موجودہ صورت حال کو اسلام اور حق و انصاف کے مطابق سمجھتا ہو اور اسے بدلنے کا متمنی نہ ہو۔ آخر ہم مسلمان رہتے ہوئے حکومت ...

طرزِ عمل کے بارے میں کس طرح غیر متعلق تماشائی بن سکتے ہیں۔ اسلام ہم سے بار بار اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اپنی ساری قوتیں، اپنی ساری صلاحیتیں، اپنے اسباب و وسائل اُس کے دین کی سربلندی کے لیے صرف کریں۔ حکومت ہماری اجتماعی قوت کا سب سے بڑا مرکز ہے اس مرکز کو ہم جان بوجھ کر غیر اسلامی سرگرمیوں کا اڈا کس طرح بنا سکتے ہیں۔ جس طرح ایمان کا شعور حاصل ہو جانے کے بعد ہم پر سب سے پہلا فرض یہ عائد ہوتا ہے کہ ہم اپنے قلب و دماغ سے غیر اسلامی نظریات کی جھاڑ جھنکار صاف کر کے اس میں خشیتِ الٰہی کے بیج بوئیں اور صالح اعمال سے ان کی آبیاری کریں تاکہ سیرت و کردار کے پھول کھل کر پوری فضا کو معطر کر دیں۔ بالکل اسی طرح ہم پر ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ بات بھی لازم ہے کہ ہم اپنی اجتماعی قوت کے مختلف مراکز سے جاہلیت کی اکاس بیل کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر پھینک دیں اور وہاں اسلام کے سایہ دار شجر کو جڑ پکڑنے کے پورے مواقع فراہم کریں تاکہ زخموں سے چور انسانیت اس کے زیرِ اثر پناہ لیکر آرام اور سکون حاصل کر سکے۔

یقین کیجیے ہمارے اس "سیاسی طرزِ عمل" پر جب کبھی گرفت کی گئی تو ہم نے ایمانداری کے ساتھ اس مسئلہ پر بار بار غور کیا، اس پر مختلف انداز سے سوچا۔ گرفت کرنے والوں کی امانت و دیانت، اخلاص اور اسلام سے گہری محبت کو سامنے رکھ کر اس طرزِ عمل کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا لیکن ہم بڑی صاف گوئی سے یہ عرض کرتے ہیں کہ ہم پر سیاست کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی غلطی واضح نہیں ہو سکی۔ ہم یہ بات ابھی تک سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جب انفرادی طور پر ہم اسلام کے خادم ہیں تو ہماری انفرادی کوششوں کے تعامل سے جو اجتماعی قوت پیدا ہوتی ہے اسے ہم اسلام کی خدمت اور چاکری میں کیوں نہ صرف کریں اور جو لوگ کہ اس راہ میں محض ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر حائل ہو رہے ہیں انہیں یا تو راہِ راست پر لانے کے لیے جد و جہد کریں یا بصورتِ دیگر

انہیں اس راہ سے ہٹا دیں۔ یہ ایک سیدھی سی منطق ہے جس میں کوئی اینچ پیچ نہیں۔ یہ ہم سے ہمارے دین کا مطالبہ ہے، یہ ہمارا جمہوری حق ہے اور یہ حق و انصاف کا ایک ایسا تقاضا ہے جس سے ہمیں دنیا کی کوئی قوت باز نہیں رکھ سکتی۔ ہمیں تو یہ بات اسلام اور حق و انصاف کے منافی نظر آتی ہے کہ کوئی گروہ اپنے آپ کو مسلمان بھی کہے اور برسرِ اقتدار آنے کے بعد وہ ایسے کاموں کی پشت پناہی شروع کر دے جو اسلام کی عین ضد ہیں۔ وہ مسلمانوں کی اجتماعی طاقت کو مسلم معاشرہ میں منکرات پھیلانے اور ان کے مال کو فیشن پرستی اور عیاشی کو فروغ دینے اور عورتوں کو اخلاق سوز مظاہرے کرنے پر خرچ کرے۔ اس طرزِ عمل کو ہم امانت اور دیانت کے خلاف سمجھتے ہیں اگر کسی طبقہ کو یہ سرگرمیاں عزیز ہیں تو پھر دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی ایسی قوم میں جا کر اپنی قسمت آزمائی کرے جسے ان سرگرمیوں سے محبت ہو اور وہ انہیں اپنے معاشرے میں پھیلانے کے لیے بیتاب ہوں۔ ان مغرب پرستوں کے اپنے نظریات کے مطابق بھی حکومت کو عوامی خواہشات اور تمناؤں کا مظہر ہونا چاہیے۔ اور یہ وہ سبق ہے جسے یہ لوگ دن رات دہراتے رہتے ہیں لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اقتدار کے تخت پر براجمان ہوتے ہی یہ سبق انہیں کیوں بھول جاتا ہے۔ کیا انہوں نے معاملہ کے اس پہلو پر کبھی غور کیا ہے؟ افلا یتدبرون۔

بے جا نہ ہوگا اگر اس موقع پر ایک دو باتیں ہم اُن حضرات کی خدمت میں بھی عرض کر دیں جو جماعت اسلامی سے کسی حیثیت سے بھی وابستہ ہیں یا وابستہ ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں پہلی بات جو ہم ان سے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ براہِ کرم اس جماعت کی نوعیت کو واضح طور پر سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ یہ خالصتاً ایک دینی قافلہ ہے۔ ایک ایسا قافلہ جس کی قیادت کا منصب تاریخ کے مختلف ادوار میں انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ میں رہا ہے، اور اس قافلہ کے سالارِ اعظم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد جو اس سلسلۃ الذھب کی آخری کڑی تھے، اس کی سربراہی اُمت کے بڑے بڑے ائمہ اور

صلحاء نے کی ہے۔ ہمیں اس امر کا پورا پورا طرح اعتراف ہے کہ سیرت و کردار، اخلاق و اطوار کے اعتبار سے ہمیں ان نفوسِ قدسی سے کوئی دور کی بھی نسبت نہیں لیکن یہ بات ہم کسی فخر کی بنا پر نہیں بلکہ محض اعترافِ نعمت کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ ہماری ساری کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود ہم اپنے سامنے منزل وہی رکھتے ہیں جو ہمارے ہادیٔ برحق سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے متعین فرمائی ہے۔ اس بنا پر دین ہی ہماری اساس، اور ہمارے فکر و عمل کا اصل محرک ہے۔ یہ ہماری تحریک کا منبع و مولد بھی ہے اور مشعل راہ بھی۔ ہم اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں کہ زندگی کے کسی دائرہ میں بھی خواہ اُس کا تعلق قانون و اجتماع سے ہو، تہذیب و تمدن سے، معیشت و معاشرت سے یا اخلاق و روحانیت سے، ہم دین کو نظر انداز کر کے کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اور اگر کبھی ہم نے ایسا کرنے کی کوشش کی تو ہم دنیا اور آخرت دونوں میں ذلیل اور رسوا ہوں گے۔ بہت سی ایسی چیزیں جو دوسروں کے لیے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہیں، ہمارے لیے سرے سے بیکار ہیں بلکہ بہت حد تک نقصان دہ ہیں اور بہت سے ایسی خوبیاں جنھیں دوسرے لوگ جنوں، رجعت پسندی اور تنگ نظری سے تعبیر کرتے ہیں وہ ہمارے نزدیک بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔

ہم جس قافلہ کے ساتھ وابستہ ہیں اُس کی منزلِ مقصود نہ تو ملک گیری اور کشور کشائی ہے اور نہ مال و متاع کا حصول۔ ہماری منزل کا پہلا قدم بھی رضائے الٰہی ہے اور آخری قدم بھی اپنے آقا و مولا کی خوشنودی۔ اس ایک مقصد کے علاوہ ہمارا کوئی مقصد نہیں یہی ہماری اصل غایت ہے اور اسی کے حصول کی خاطر ہم میدان میں اترے ہیں۔ جس دن ہم سے ہمارا یہ مقصد اوجھل ہو گیا سمجھ لیجیے اُسی دن ہم دنیا اور آخرت دونوں میں نامراد ہو گئے۔ اس بنا پر ہماری کامیابی کا اندازہ کرنے کے لیے کچھ دوسرے پیمانے ہیں جو دنیا پرستوں کو بڑے عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کے نزدیک کسی تحریک کی کامیابی کا انحصار افراد کی تعداد اور مادی اسباب

وہ وسائل کی زیادتی پر ہے لیکن ہمارے نزدیک ہمارے قافلے کی کامیابی کا سارا دارومدار ہماری اخلاقی قوت پر ہے۔ یہ ہمارا ایک زبردست سہارا ہے۔ ملکی انتخاب یا مسابقت کے دوسرے میدانوں میں بازی ہار جانا ہمارے لیے قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن ہم اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ اخلاقی میدان میں شکست کھا جانے کے بعد مال ومتاع کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار یا عزوجاہ کی کوئی اونچی سے اونچی سطح ہمیں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں کر سکتی۔ جب اخلاقی دائرے میں ہم پسپا ہو جائیں تو پوری دنیا کا غلبہ اور اقتدار بھی ہمارے کسی کام نہیں آسکتا۔ یہ ہمارے لیے بالکل عبث اور بیکار ہے بلکہ انتہائی خطرناک اور نقصان دہ۔ کیونکہ قیامت کے دن جب ہمارے خلاف اللہ کے حضورؐ میں استغاثہ قائم کیا جائے گا تو انصاف طلب کرنے والوں میں ایک مدعی خود اقتدار بھی ہوگا، اور وہ کہیگا "بارالہا! میں نے اپنی عنانِ اختیار ان اسلام کے دعویداروں کے سپرد کی تاکہ یہ میری قوت کو دین کی سربلندی کے لیے صرف کریں لیکن انہوں نے اس موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا بلکہ میری توانائی کو جاہلیت کے فروغ دینے میں کھپاتے رہے۔ اے میرے مالک وخالق! میں بہرحال اس معاملے میں بری الذمہ ہوں، اے میرے مولا! ان لوگوں نے مجھ پر ظلم اور زیادتی کی ہے براہِ کرم دادرسی فرما"

بالکل اسی طرح مال واسباب کی فراوانی جو دوسری تحریکوں کے لیے قوت وطاقت کا سرچشمہ ہے ہمارے لیے اسی صورت میں مفید اور کارآمد ہے جب ہمارے عمل کا محرک صرف اللہ کی محبت ہو اور اگر یہ جذبہ سرد پڑ جاتے تو پھر یہ مال واسباب ہماری ترقی کی ضمانت نہیں بلکہ ہماری بربادی کا پیغام ہیں۔ مقوی غذا اسی شخص کے لیے نافع اور فائدہ مند ہوتی ہے جس کا معدہ صحیح طور پر کام کر رہا ہو۔ ایک علیل اور بیمار انسان کے لیے یہ غذا ضرررساں ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ہم اخلاقی طور پر صحت مند ہیں، اگر ہم دین کے معاملے میں مخلص ہیں، اگر ہمارا اپنے مالک سے رشتہ صحیح اور درست ہے تو پھر یہ دنیاوی وسائل

ہمارے لیے خیر و برکت کا موجب ہیں ورنہ یہ ہمارے لیے اسی طرح تباہ کن ہیں جس طرح کہ کسی دیوانے کے ہاتھ میں شمشیرِ برہنہ دے کر اُسے انسانوں کی بستیوں میں آزاد چھوڑ دیا جائے۔

اس حقیقت کو اچھی طرح دل و دماغ میں بٹھا لیجیے کہ ہماری منزل جاہلیت کی منزل سے یکسر مختلف ہے اور اس بنا پر ہمارے فکر و نگاہ کے زاویے، ہمارے افعال و اعمال کے محرکات، ہمارے کامیابی و ناکامی کے معیار، ہمارے خوب و ناخوب کے پیمانے، ہماری دوستیوں اور دشمنیوں کے انداز، الغرض ہماری پوری جدوجہد غیر مسلم قوموں کی جدوجہد سے یکسر الگ اور جداگانہ ہے۔

خشیتِ الٰہی ہمارے اس قافلہ کی طاقت کا سرچشمہ ہے، للّٰہیت اس کا زادِ سفر، تقویٰ اور پرہیزگاری اس کی اصل پونجی جس کے بل بوتے پر یہ قافلہ آگے بڑھتا ہے۔ اللہ کی محبت اسے سرگرمِ عمل کرتی ہے، خدا ترسی اسے جادۂ مستقیم پر گامزن رکھتی ہے، اور اپنے مالک اور خالق کا خوف اور احساسِ جواب دہی اسے غلط راستوں پر بھٹکنے سے روکتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمتوں پر بھروسا اور اعتماد اور آخرت میں اُس کی نعمتوں اور نوازشات کی توقعات اسے یہ ہمت اور توانائی بخشتی ہیں کہ وہ نہایت نامساعد اور حوصلہ شکن حالات میں بھی مایوس نہ ہونے پاتے اور ایک آن دیکھے خدا پر یقین رکھتے ہوئے قدم بڑھاتا چلا جاتا ہے۔

اپنے رب اور خالق پر پختہ ایمان، اور اپنی دعوت کے صحیح ہونے کا گہرا یقین، یہ وہ نقطۂ آغاز ہے جس سے کوئی خادمِ دین جماعت اپنے کام کو شروع کرتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جس بلند و بالا ذات کی رضا جوئی کے لیے اس سفر کا آغاز کیا جا رہا ہے اور جس منزلِ مقصود کے حصول کے لیے یہ ساری تگ و دو ہو رہی ہے، اگر اُس کی ذات پر غیر معمولی اعتماد اور اُس کے بتائے ہوئے راستے کی صحت کا کامل یقین نہ ہوگا تو اس قافلے کے جلد ہی حوصلے

پست ہو جائیں گے اور چند قدم اٹھانے کے بعد یہ حرص و ہوا کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہو کر اپنا راستہ کھو دیگا۔ قرآن و سنّت میں اس امر کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ — اُس زندہ و جاوید ذات پر بھروسہ کرو جسے فنا نہیں۔ (فرقان - ۵)

پھر ایک دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرمایا:

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (آل عمران ۱۶) — جو مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے

اس توکّل کے ساتھ دوسری اہم صفت استقامت ہے۔ یعنی آپ کا اللہ پر بھروسہ کسی وقتی جوش کا نتیجہ نہ ہو بلکہ آپ اس مسلک پر ہمیشہ، ہر قسم کے حالات میں مضبوطی سے قائم رہیں۔ ایمان کی شمع جب ایک مرتبہ دل و دماغ میں روشن ہو جائے تو پھر مخالفتوں کی شدید سے شدید آندھیاں یا فتنوں کے خوفناک سے خوفناک جھکڑ اسے بجھا نہ سکیں۔ ایمان فی الحقیقت ایک عشق ہے کہ جب کوئی شخص اس میں گرفتار ہو جاتا ہے تو پھر اس راہ کی کوئی مزاحمت، مزاحمت نہیں معلوم ہوتی، کوئی مصیبت مصیبت نہیں رہتی اور شوقِ منزل انسان کو راستے کی تمام دشواریوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ عشق کی آگ سارے مصائب و شدائد اور تمام آلامِ حیات کو جلا کر خاک کر دیتی ہے:

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

قرآن مجید میں اس امر کی بار بار تلقین کی گئی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے

اِنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْا — تمہارا معبود ایک ہی ہے، سو اللہ کی ادھ میں

اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ (حٰمٓ السجدہ - ۱)	استقامت اختیار کرو اور اسی سے اپنے گناہ کی معافی طلب کرو۔
فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (ہود - ۱۰)	(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، تو ثابت قدم رہ جیسے کہ تجھے حکم دیا گیا ہے۔
اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (احقاف - ۲)	بے شک جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہی ہے۔ وہ پھر اس بات پر ثابت قدم رہے تو اُن کے لیے نہ تو کوئی ڈر ہے اور نہ کوئی خوف۔

حضرت ابوعمرو سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک مرتبہ دربارِ رسالت میں عرض کی کہ مجھے براہِ کرم اسلام کے بارے میں کوئی ایسی حقیقت بتا دیں جس کے سمجھ لینے کے بعد پھر مجھے کسی دوسرے سے کچھ دریافت کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے تو آپ نے اپنے مخصوص مبلغانہ انداز میں فرمایا:

"تم اللہ کا اقرار کرو اور پھر اس پر ثابت قدم رہو" (صحیح مسلم)

ایمان باللہ اور پھر اس میں استقامت کے علاوہ ایک ضروری چیز اسلام کی دعوت پر مکمل یقین ہے۔ ایک انسان کو جب تک اُس دعوت کے صحیح ہونے پر پورا پورا اعتماد نہ ہوگا وہ اس دعوت کو کبھی بھی یکسوئی اور عزم کے ساتھ پیش نہ کر سکے گا۔ دین کی دعوت کوئی فلسفیانہ مباحثہ نہیں جس میں شک و شبہ اور اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ یہ اللہ کا نازل کردہ ضابطۂ حیات ہے جسے اُس کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم تک پہنچایا ہے اس میں کسی قسم کا کوئی اشتباہ اور شک نہیں۔ اس کی صحت کے بارے میں کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں اس میں مداہنت کی کوئی صورت پیدا نہیں کی جا سکتی۔ یہ ایک مکمل دین ہے، ہر عیب سے

پاک اور ہر سقم سے مبّرا یہی ایک راستہ ہے جسے اختیار کرنے کے بعد انسان دنیا اور آخرت کی سعادتیں حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ بالکل لغو اور بیکار ہے۔ چنانچہ قرآن وسنت میں اس کی پوری تصریح موجود ہے:

ان الدین عند اللہ الاسلام (آل عمران۔ آیت ۱۹)	اللہ کے نزدیک (صحیح) دین تو بس اسلام ہی ہے۔
وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ (سورۃ آل عمران)	جس کسی نے اسلام کے سوا کسی دین کی پیروی کی تو وہ دین ہرگز اُس سے قبول نہ کیا جائیگا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا

پھر دیکھیے کس دعویٰ اور تحدّی کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلایا گیا۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ط ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (سورۃ انعام)	(اے پیغمبر) یہ بھی کہہ دیجیے، کہ میری سیدھی شاہراہ یہی ہے، سو اسی پر گامزن ہو، اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اُس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے رب نے تمہیں کی ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

جب تک انسان کے دل و دماغ میں اسلام پر پوری طرح اعتماد نہ پیدا ہو مجرد اس تصدیق سے کہ اللہ ایک ہے، حضور سرور دو عالم اُس کے آخری نبی ہیں اور اسلام اُس کا دلپسند دین ہے، آدمی ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے حدیث میں فرمایا گیا۔

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربًا وبالاسلام دینًا وبمحمدٍ رسولا مسلم	وہ شخص ایمان سے صحیح معنوں میں لذت آشنا ہُوا جو اللہ کے اپنا رب ہونے پر، اسلام کے اپنا دین ہونے پر، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کے اپنا رسول ہونے پر مطمئن ہو گیا۔

یہی وہ لازوال اعتماد ہے جس کی غمازی حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کرتی ہے اور جس کی آپ نے بار بار تلقین فرمائی ہے۔ احادیث اور سیرت کی کتابیں اس سے بھری پڑی ہیں۔

نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت کا آغاز کیا تو مخالفتوں کا طوفان اُمڈ پڑا۔ مونس اور غمخوار چچا جس نے آپ کو اپنی آغوشِ محبت میں پالا تھا اور جس کی شفقت آپ کے لیے دنیاوی سہاروں میں ایک بہت بڑا سہارا تھی۔ اس نے بھی گھبرا کر یہ نصیحت کی:

"اے میرے محبوب بھائی کے لختِ جگر! تمہاری قوم میرے پاس آئی تھی اور اُس نے مجھ سے تمہارے متعلق یہ شکایت کی ہے کہ تم اُس کے معبودوں کو گالیاں دیتے ہو۔ اُس کے دین میں عیب نکالتے ہو اُس کے عقلمندوں کو بیوقوف اور اُس کے بزرگوں کو گمراہ ٹھہراتے ہو۔ اے میرے بیٹے مجھ پر رحم کرو اور خود اپنی جان پر بھی رحم کھاؤ۔ مجھ پر ایسا بار نہ ڈالو جس کا میں متحمل نہیں ہو سکتا"۔

راوی کا بیان ہے کہ حضور سرورِ دو عالمؐ جب اپنے چچا کے یہ الفاظ سنے تو انہیں اس امر کا احساس ہوا کہ شاید اب چچا کی حمایت انہیں حاصل نہ رہے کیونکہ وہ مخالفتوں اور مخاصمتوں کے اس ہجوم میں اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ ان پر آشوب حالات میں جب عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا۔ دنیاوی سہارے ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے تھے اُس وقت حضورؐ نے پورے عزم کے ساتھ ارشاد فرمایا:

یا عمّ واللہ لو وضعوا الشمس	اے میرے چچا! قسم ہے خدائے بزرگ و
فی یمینی والقمر فی یساری علیٰ ان	برتر کی اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر

اترك هذا الامر حتی یظهره الله او اهلك فیه ما ترکته۔

(سیرت ابن ہشام)

سورج اور بائیں پر چاند بھی رکھ دیں کہ میں اس دعوت کو ترک کر دوں تو میں اسے ہرگز ترک نہ کروں گا میں مسلسل جدوجہد کرتا رہوں گا یہاں تک کہ یا تو اللہ تعالیٰ اس دین کو غلبہ عطا کرے یا پھر میں اپنی جان جان آفریں کے حوالے کر دوں۔

ایک دوسرے مقام پر اس سعی و جہد کے سرور کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

ولوددت انی اقتل فی سبیل الله ثم احیا ثم اقتل، ثم احیا ثم اقتل[1]

میں اس بات کا آرزومند ہوں کہ میں اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں مجھے دوبارہ زندگی عطا کی جائے اور پھر میں شہید کیا جاؤں۔ پھر مجھے زندگی عطا کی جائے اور پھر میری جان اس کی راہ میں نثار ہو۔

پھر فرمایا:

مثل المجاهد فی سبیل الله کمثل الصائم القائم القانت بآیات الله لا یفطر من صیام ولا صلوٰة حتی یرجع المجاهد فی سبیل الله و توکل الله للمجاهد فی سبیله بان یتوفاه ان یدخله الجنة، او یرجعه سالما مع ما نال من اجر و غنیمة[2]

اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا شخص جب تک میدانِ جہاد سے واپس نہیں لوٹتا اُس وقت تک اس کی مثال اُس شخص کی ہے جو دائمی روزہ دار ہو، شب بیدار ہو، ذکرِ اللہ میں محو رہتا ہو اور نماز و روزے سے کبھی نہ اکتاتا ہو۔ ایسے شخص کو خود اللہ تعالیٰ نے اس امر کی ضمانت دی ہے کہ راہ خدا میں شہید ہونے کی صورت میں اُسے جنت میں داخل کیا جائیگا اور زندہ واپس لوٹنے کی صورت میں وہ اجرِ الٰہی کا مستحق ہو گا اور غنائم سے مالا مال ہو گا۔

[1] رواہ الامام احمد والبخاری و مسلم، والنسائی من حدیث ابی ہریرہ۔ بحوالہ زاد المعاد جلد دوم ص ۵۵۔

[2] اخرجہ البخاری و مسلم والترمذی والنسائی من حدیث ابی ہریرۃ۔ " " " " ص ۱۵۶

ایک مومن صادق صرف اسلام کی دعوت پر ہی غیر متزلزل یقین نہیں رکھتا بلکہ اُسے اس کے نتائج پر بھی پُورا پُورا بھروسہ ہوتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ خواہ اس راہ میں کتنی مشکلات اور کتنے موانع درپیش ہوں لیکن اللہ کا دین بالضرور دنیا میں غالب ہو کر رہیگا۔ دشمنوں کی فتنہ پردازیاں، ظالموں کی چیرہ دستیاں، منافقوں کی ریشہ دوانیاں لازمی طور پر ختم ہونگی اور فتنہ و فساد کی اس تاریک فضا سے دینِ حق کا آفتاب طلوع ہو کر پوری کائنات کو اپنی زندگی بخش شعاعوں سے منوّر کر دے گا۔

حضرت ابو عبداللہ خباب بن الارت سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں حضُور کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہُوا۔ حضور سرورِ دوعالم اُس وقت چادر اوڑھے کعبہ کے سایہ میں ٹیک لگا کر آرام فرما رہے تھے۔ میں نے بارگاہِ نبوی میں عرض کی: اے ہادیِ برحق آپ ہمارے لیے باری تعالیٰ سے تائید و نصرت کی دعا کیوں نہیں کرتے؟ اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: اگلی امتوں میں دینِ حق کے علمبردار ظالموں کے پنجۂ استبداد میں کسے جاتے رہے ہیں۔ دشمنانِ دین اُن کے لیے گڑھے کھودتے اور ان میں انہیں گاڑ دیا جاتا۔ پھر ان کے سروں پر آرہ رکھ کر چلایا جاتا اور اس طرح اُن کے سر کے دو ٹکڑے کر دیئے جاتے۔ اُن کے جسموں پر لوہے کی کنگھی کی جاتی جو ہڈی اور گوشت میں دھنستی ہوئی نکل جاتی تھی۔ مگر یہ سارے مصائب و شدائد ان کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل نہ پیدا کر سکے اور دین کے ساتھ اُن کی وابستگی میں سرِ مو فرق نہ آیا۔ قسم ہے اس ذاتِ برحق کی، میرا خالق اس مقدس کام کو ضرور پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت کی طرف چلے گا اور اسے سوائے خوفِ الٰہی کے اور کسی کا خوف لاحق نہ ہوگا۔ البتہ ایک چرواہے کو اپنی بھیڑ بکریوں کے متعلق بھیڑیئے کا ڈر ہوگا۔ لیکن آخر تم جلد بازی سے کیوں کام لیتے ہو؟

تفہیم القرآن

سبا

(۳)

پھر جب سلیمانؑ پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اُس گھُن کے سوا نہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمان گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھُل گئی[۲۲] کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے[۲۳]

۲۲ء اصل الفاظ ہیں تَبَیَّنَتِ الْجِنُّ۔ اس فقرے کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو ہم نے اوپر متن میں کیا ہے۔ اور دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنوں کا حال کھل گیا یا منکشف ہو گیا۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ خود جنوں کو پتہ چل گیا کہ غیب دانی کے متعلق ان کا زعم غلط ہے۔ دوسری صورت میں معنی یہ ہونگے کہ عام لوگ جو جنوں کو غیب داں سمجھتے تھے ان پر یہ راز فاش ہو گیا کہ وہ کوئی علم غیب نہیں رکھتے۔

۲۳ء موجودہ زمانے کے بعض مفسرین نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ حضرت سلیمان کا بیٹا رُحبعام چونکہ نالائق اور عیش پسند تھا اور خوشامدی مصاحبوں میں گھرا ہوا تھا، اس لیے اپنے جلیل القدر والد کی وفات کے بعد وہ اُس بارِ عظیم کو نہ سنبھال سکا جو اس پر آ پڑا تھا۔ اس کی جانشینی کے تھوڑی مدت بعد ہی سلطنت کا قصر دھڑام سے زمین پر آ رہا اور گردوپیش کے جن سرحدی قبائل (یعنی جنوں) کو حضرت سلیمانؑ نے اپنی قوتِ قاہرہ سے خادم بنا رکھا تھا وہ سب قابو سے نکل گئے۔ لیکن یہ تاویل کسی طرح بھی قرآن کے الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ قرآن کے الفاظ جو نقشہ ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان پر ایسی حالت میں موت طاری ہوئی جبکہ وہ ایک عصا کے

سہارے کھڑے یا بیٹھے تھے۔ اس عصا کی وجہ سے ان کا بے جان جسم اپنی جگہ قائم رہا اور جن یہ سمجھتے ہوتے ان کی خدمت میں لگے رہے کہ وہ زندہ ہیں۔ آخر کار جب عصا کو گھن لگ گیا اور وہ اندر سے کھوکھلا ہو گیا تو اُن کا جسم زمین پر گر گیا اور اس وقت جنوں کو پتہ چلا کہ اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس صاف اور صریح بیانِ واقعہ کو آخر یہ معنی پہنانے کی کیا معقول وجہ ہے کہ گھن سے مُراد حضرت سُلیمان کے بیٹے کی نالائقی ہے، اور عصا سے مراد اُن کا اقتدار ہے، اور ان کے مردہ جسم کے گر جانے سے مراد ان کی سلطنت کا پارہ پارہ ہو جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اگر یہی مضمون بیان کرنا ہوتا تو کیا اس کے لیے عربی مبین میں الفاظ موجود نہ تھے کہ اس ہیر پھیر کے ساتھ اسے بیان کیا جاتا ؟ یہ پہیلیوں کی زبان آخر قرآن مجید میں کہاں استعمال کی گئی ہے ؟ اور اُس زمانے کے عام عرب جو اس کلام کے اوّلین مخاطب تھے، یہ پہیلی کیسے بوجھ سکتے تھے ؟

پھر اس تاویل کا سب سے زیادہ عجیب حصہ یہ ہے کہ اس میں جنوں سے مراد وہ سرحدی قبائل لیے گئے ہیں جنہیں حضرت سلیمانؑ نے اپنی خدمت میں لگا رکھا تھا۔ سوال یہ ہے کہ آخر ان قبائل میں سے کون غیب دانی کا مدعی تھا اور کس کو مشرکین غیب داں سمجھتے تھے ؟ آیت کے آخری الفاظ کو اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر پڑھے تو وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جن سے مراد یہاں لازماً کوئی ایسا گروہ ہے جو یا تو خود غیب دانی کا دعویٰ رکھتا تھا، یا لوگ اس کو غیب داں سمجھتے تھے، اور اس گروہ کے غیب سے ناواقف ہونے کا راز اس واقعہ نے فاش کر دیا کہ وہ حضرت سلیمانؑ کو زندہ سمجھتے ہوتے خدمت میں لگے رہے، حالانکہ ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ قرآن مجید کا یہ بیان اس کے لیے کافی تھا کہ ایک ایمان دار آدمی اس کو دیکھ کر اپنے اس خیال پر نظرِ ثانی کر لیتا کہ جن سے مراد سرحدی قبائل ہیں۔ لیکن جو لوگ مادہ پرست دنیا کے سامنے جن نامی ایک پوشیدہ مخلوق کا وجود تسلیم کرتے ہوئے شرماتے ہیں وہ قرآن کی اس تصریح کے باوجود اپنی تاویل پر مُصر ہیں۔

قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ مشرکینِ عرب جنوں کو اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتے تھے، انہیں اللہ کی اولاد سمجھتے تھے اور ان سے پناہ مانگا کرتے تھے :

۲۵؎ سبا کے لیے ان کے اپنے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی[۲۶]، دو باغ دائیں اور

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ (الانعام - ۱۰۰)	اور انہوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھیرایا، حالانکہ اس نے ان کو پیدا کیا ہے۔
وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (الصّٰفّٰت - ۱۵۸)	اور انہوں نے اللہ کے اور جنوں کے درمیان نسبی تعلق تجویز کر لیا۔
وَاَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (الجن - ۶)	اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے۔

انہی عقائد میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ وہ جنوں کو عالم الغیب سمجھتے تھے اور غیب کی باتیں جاننے کے لیے اُن کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ یہاں اسی عقیدے کی تردید کے لیے یہ واقعہ سُنا رہا ہے اور اس سے مقصود کفارِ عرب کو یہ احساس دلانا ہے کہ تم لوگ خواہ مخواہ جاہلیت کے غلط عقائد پر اصرار کیے چلے جا رہے ہو حالانکہ تمہارے یہ عقائد بالکل بے بنیاد ہیں۔

۲۵؎ سلسلۂ بیان کو سمجھنے کے لیے رکوع اول کے مضمون کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ اُس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کفارِ عرب آخرت کی آمد کو بعید از عقل سمجھتے تھے اور جو رسولؐ اس عقیدے کو پیش کر رہا تھا اس کے متعلق کھلم کھلا یہ کہہ رہے تھے کہ ایسی عجیب باتیں کرنے والا آدمی یا تو مجنون ہو سکتا ہے، یا پھر وہ جان بوجھ کر افترا پردازی کر رہا ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے پہلے چند عقلی دلائل ارشاد فرماتے جن کی تشریح ہم حواشی نمبر ۷، ۸ اور ۱۲ میں کر چکے ہیں۔ اس کے بعد رکوع دوم میں حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ کا قصہ اور پھر سبا کا قصہ ایک تاریخی دلیل کے طور پر بیان کیا گیا ہے جس سے مقصود یہ حقیقت ذہن نشین کرنا ہے کہ روئے زمین پر خود نوعِ انسانی کی اپنی سرگزشت قانونِ مکافات کی شہادت دے رہی ہے۔ انسان اپنی تاریخ کو غور سے دیکھے تو اسے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے جس کا سارا کارخانہ اندھا دھند چل رہا ہو بلکہ اس پر ایک سمیع و بصیر خدا فرمانروائی کر رہا ہے جو شکر کی راہ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ایک معاملہ کرتا ہے اور ناشکری و کافر نعمتی

بائیں ۲۷؎ کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور شکر بجالاؤ اُس کا، ملک ہے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار ہے بخشش فرمانے والا۔ مگر وہ منہ موڑ گئے ۲۸؎ آخر کار ہم نے اُن پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا ۲۹؎ اور ان کے پچھلے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ انہیں دیئے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں ۳۰؎ یہ تھا ان کے کفر کا بدلہ جو ہم نے ان کو دیا، اور ناشکرے انسان کے سوا ایسا بدلہ ہم اور کسی کو نہیں دیتے۔

کی راہ چلنے والوں کے ساتھ بالکل ہی ایک دوسرا معاملہ فرماتا ہے۔ کوئی سبق لینا چاہے تو اسی تاریخ سے یہ سبق لے سکتا ہے کہ جس خدا کی سلطنت کا یہ مزاج ہے اس کی خدائی میں نیکی اور بدی کا انجام کبھی یکساں نہیں ہو سکتا۔ اس کے عدل و انصاف کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک ، وقت ایسا آئے جب نیکی کا پورا اجر اور بدی کا پورا بدلہ دیا جائے

۲۶؎ یعنی اس امر کی نشانی کہ جو کچھ ان کو میسر ہے وہ کسی کا عطیہ ہے نہ کہ ان کا اپنا آفریدہ۔ اور اس امر کی نشانی کہ ان کی بندگی و عبادت اور شکر و سپاس کا مستحق وہ خدا ہے جس نے ان کو یہ نعمتیں دی ہیں نہ کہ وہ جن کا کوئی حصہ ان نعمتوں کی بخشش میں نہیں ہے۔ اور اس امر کی نشانی کہ ان کی دولت لازوال نہیں ہے بلکہ جس طرح آئی ہے اُسی طرح جا بھی سکتی ہے۔

۲۷؎ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پورے ملک میں بس دو ہی باغ تھے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ سبا کی پوری سرزمین گلزار بنی ہوئی تھی۔ آدمی جہاں بھی کھڑا ہوتا اسے اپنے دائیں جانب بھی باغ نظر آتا اور بائیں جانب بھی۔

۲۸؎ یعنی بندگی و شکر گزاری کے بجائے انہوں نے نافرمانی و نمک حرامی کی روش اختیار کرلی۔

۲۹؎ اصل میں لفظ سَیْلُ الْعَرِم استعمال کیا گیا ہے۔ عَرِم جنوبی عرب کی زبان کے لفظ عرمن سے ماخوذ ہے جس کے معنی "بند" کے ہیں۔ یمن کے کھنڈروں میں جو قدیم کتبات موجودہ زمانے میں دستیاب ہوئے ہیں، ان میں یہ لفظ اس معنی میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ۵۴۲ء یا ۵۴۳ء کا ایک کتبہ جو یمن کے حبشی گورنر ابرہہ نے سدِ مارب کی مرمت کرانے کے بعد نصب

اور ہم نے اُن کے اور اُن بستیوں کے درمیان، جن کو ہم نے برکت عطا کی تھی، نمایاں بستیاں بسا دی تھیں اور اُن میں سفر کی مسافتیں ایک اندازے پر رکھ دی تھیں۳۱۔ چلو پھرو اِن راستوں میں رات دن پُورے امن کے ساتھ۔ مگر انہوں نے کہا "اے ہمارے رب ہمارے سفر دور دراز کر دے"۳۲۔ انہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا۔ آخر کار ہم نے

کرایا تھا اس میں وہ اس لفظ کو بار بار بند کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا سیل العرم سے مراد وہ سیلاب ہے جو کسی بند کے ٹوٹنے سے آئے۔

۳۰۔ یعنی سیل العرم کے آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا علاقہ برباد ہو گیا۔ سبا کے لوگوں نے پہاڑوں کے درمیان بند باندھ باندھ کر جو نہریں جاری کی تھیں وہ سب ختم ہو گئیں اور آب پاشی کا پورا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ اس کے بعد وہی علاقہ جو کبھی جنت نظیر بنا ہوا تھا خود رو جنگلی درختوں سے بھر گیا اور اس میں کھانے کے قابل اگر کوئی چیز باقی رہ گئی تو وہ محض جھاڑی بوٹی کے بیر تھے۔

۳۱۔ "برکت والی بستیوں" سے مراد شام و فلسطین کا علاقہ ہے جسے قرآن مجید میں عموماً اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الاعراف، آیت ۱۳۷۔ بنی اسرائیل آیت ۱۔ الانبیاء، آیات ۷۱ و ۸۱)۔

"نمایاں بستیوں" سے مراد ہیں ایسی بستیاں جو شاہراہ عام پر واقع ہوں، گوشوں میں چھپی ہوئی نہ ہوں۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بستیاں بہت زیادہ فاصلے پر نہ تھیں بلکہ متصل تھیں۔ ایک بستی کے آثار ختم ہونے کے بعد دوسری بستی کے آثار نظر آنے لگتے تھے۔

سفر کی مسافتوں کو ایک اندازے پر رکھنے سے مراد یہ ہے کہ یمن سے شام تک کا پورا سفر مسلسل آباد علاقے میں طے ہوتا تھا جس کی ہر منزل سے دوسری منزل تک کی مسافت معلوم و متعین تھی۔ آباد علاقوں کے سفر اور غیر آباد صحرائی علاقوں کے سفر میں یہی فرق ہوتا ہے۔ صحرا میں مسافر جب تک چاہتا ہے چلتا ہے اور جب تھک جاتا ہے تو کسی جگہ پڑاؤ کر لیتا ہے۔ بخلاف اس کے آباد علاقوں میں راستے کی ایک بستی سے دوسری بستی تک کی مسافت جانی بوجھی اور متعین ہوتی ہے

انہیں افسانہ بنا کر رکھ دیا اور انہیں بالکل تتر بتر کر ڈالا[۳۱] یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو بڑا صابر و شاکر ہو[۳۲]۔ اُن کے معاملہ میں ابلیس نے اپنا گمان صحیح پایا اور انہوں نے اُسی کی پیروی کی، بجز ایک تھوڑے سے گروہ کے جو مومن تھا[۳۳]۔ ابلیس کو

مسافر پہلے سے پروگرام بنا سکتا ہے کہ راستے کے کن کن مقامات پر وہ ٹھیرتا ہوا جائے گا، کہاں دوپہر گزارے گا اور کہاں رات بسر کریگا۔

۳۰؎ ضروری نہیں ہے کہ انہوں نے زبان ہی سے یہ دعا کی ہو۔ دراصل جو شخص بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے وہ گویا زبانِ حال سے یہ کہتا ہے کہ خدایا میں ان نعمتوں کا مستحق نہیں ہوں۔ اور اسی طرح جو قوم اللہ کے فضل سے غلط فائدہ اٹھاتی ہے وہ گویا اپنے رب سے یہ دعا کرتی ہے کہ اے پروردگار یہ نعمتیں ہم سے سلب کرلے کیونکہ ہم ان کے قابل نہیں ہیں۔

علاوہ بریں رَبَّنَا بَاعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا (خدایا ہمارے سفر دور دراز کر دے) کے الفاظ سے کچھ یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ شاید سبا کی قوم کو اپنی آبادی کی کثرت کھلنے لگی تھی اور دوسری نادان قوموں کی طرح اس نے بھی اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو خطرہ سمجھ کر انسانی پیداوار روکنے کی کوشش کی تھی۔

۳۱؎ یعنی سبا کی قوم ایسی منتشر ہوئی کہ اس کی پراگندگی ضرب المثل ہو گئی۔ آج بھی اہل عرب اگر کسی گروہ کے انتشار کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں "تفرّقوا ایدی سبا" وہ تو ایسے پراگندہ ہو گئے جیسے سبا کی قوم پراگندہ ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب زوالِ نعمت کا دور شروع ہوا تو سبا کے مختلف قبیلے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر عرب کے مختلف علاقوں میں چلے گئے۔ غسانیوں نے اُردن اور شام کا رُخ کیا۔ اوس و خزرج کے قبیلے یثرب میں جا بسے۔ خزاعہ نے جدّے کے قریب تہامہ کے علاقہ میں سکونت اختیار کی۔ اَزد کا قبیلہ عُمان میں جا کر آباد ہوا۔ لخم اور جُذام اور کندہ بھی نکلنے پر مجبور ہوئے۔ حتیٰ کہ "سبا" نام کی کوئی قوم ہی دنیا میں باقی نہ رہی۔ صرف اس کا ذکر افسانوں میں رہ گیا۔

۳۲؎ اس سیاق و سباق میں صابر و شاکر سے مراد ایسا شخص یا گروہ ہے جو اللہ کی طرف سے

اُن پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا مگر جو کچھ ہُوا وہ اس لیے ہُوا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون آخرت کا ماننے والا ہے اور کون اس کی طرف سے شک میں پڑا ہُوا ہے[۳۶]۔ تیرا

نعمتیں پاکر آپے سے باہر نہ ہوجاتے، نہ خوشحالی پر پھولے اور نہ اُس خدا کو بھول جاتے جس نے یہ سب کچھ اسے عطا کیا ہے۔ ایسا انسان اُن لوگوں کے حالات سے بہت کچھ سبق لے سکتا ہے جنہوں نے عروج و ترقی کے مواقع پاکر نافرمانی کی روش اختیار کی اور اپنے انجامِ بد سے دوچار ہوکر رہے۔

۳۵؎ تاریخ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قدیم زمانے سے قومِ سبا میں ایک عنصر ایسا موجود تھا جو دوسرے معبودوں کو ماننے کے بجائے خدائے واحد کو مانتا تھا۔ موجودہ زمانے کی اثری تحقیقات کے سلسلے میں یمن کے کھنڈروں سے جو کتبات ملے ہیں ان میں سے بعض اس قلیل عنصر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ سنہ ۶۵۰ ق م کے لگ بھگ زمانے کے بعض کتبات بتاتے ہیں کہ مملکتِ سبا کے متعدد مقامات پر ایسی عبادت گاہیں بنی ہوئی تھیں جو ذُسموی یا ذوسماوی (یعنی رب السماء) کی عبادت کے لیے مخصوص تھیں۔ بعض مقامات پر اس معبود کا نام ملکن ذسموی (وہ بادشاہ جو آسمانوں کا مالک ہے) لکھا گیا ہے۔ یہ عنصر مسلسل صدیوں تک یمن میں موجود رہا۔ چنانچہ سنہ ۳۷۸ء کے ایک کتبے میں بھی الٰہ ذُوسموی کے نام سے ایک عبادتگاہ کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے۔ پھر سنہ ۴۶۵ء کے ایک کتبے میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں: بنصر و ردا الھن بعل سمین و ارضین (یعنی اس خدا کی مدد اور تائید سے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے)۔ اسی زمانہ کے ایک اور کتبے میں جس کی تاریخ سنہ ۴۵۸ء ہے اسی خدا کے لیے رحمان کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اصل الفاظ ہیں بردا رحمنن (یعنی رحمان کی مدد سے)۔

۳۶؎ یعنی ابلیس کو یہ طاقت حاصل نہ تھی کہ اُن کا ارادہ تو خدا کی فرمانبرداری کرنے کا ہو مگر وہ زبردستی ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں نافرمانی کی راہ پر کھینچ لے گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی قدرت اس کو دی تھی وہ صرف اس حد تک تھی کہ وہ انہیں بہکائے اور ایسے تمام لوگوں کو اپنے پیچھے لگائے جو خود اس کی پیروی کرنا چاہیں۔ اور اس اغوا کے مواقع ابلیس کو اس لیے عطا کیے گئے تاکہ آخرت،

ع رب ہر چیز پر نگران ہے ۳۷ ع

کے ماننے والوں اور اس کی آمد میں شک رکھنے والوں کا فرق کھل جائے۔

دوسرے الفاظ میں یہ ارشاد ربانی اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ عقیدۂ آخرت کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے جو اس دنیا میں انسان کو راہِ راست پر قائم رکھنے کی ضامن ہو سکتی ہو۔ اگر کوئی شخص یہ نہ مانتا ہو کہ اسے مرکر دوبارہ اٹھنا ہے اور اپنے خدا کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے، تو وہ لازماً گمراہ و بدراہ ہو کر رہے گا، کیونکہ اس کے اندر سرے سے وہ احساسِ ذمہ داری پیدا ہی نہ ہو سکے گا جو آدمی کو راہ راست پر ثابت قدم رکھتا ہے۔ اسی لیے شیطان کا سب سے بڑا حربہ، جس سے وہ آدمی کو اپنے پھندے میں پھانستا ہے، یہ ہے کہ وہ اسے آخرت سے غافل کرتا ہے۔ اس کے اس فریب سے جو شخص بچ نکلے وہ کبھی اس بات پر راضی نہ ہو گا کہ اپنی اصل دائمی زندگی کے مفاد کو دنیا کی اس عارضی زندگی کے مفاد پر قربان کر دے۔ بخلاف اس کے جو شخص شیطان کے دام میں آکر آخرت کا منکر ہو جاتے، یا کم از کم اس کی طرف سے شک میں پڑ جائے، اُسے کوئی چیز اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتی کہ جو نقد سودا اس دنیا میں ہو رہا ہے اُس سے صرف اس لیے ہاتھ اٹھا لے کہ اُس کے کسی بعد کی زندگی میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ دنیا میں جو شخص بھی کبھی گمراہ ہوا ہے اسی انکارِ آخرت یا شک فی الآخرۃ کی وجہ سے ہوا ہے، اور جس نے بھی راست روی اختیار کی ہے اس کے صحیح طرزِ عمل کی بنیاد ایمان بالآخرۃ ہی پر قائم ہوئی ہے۔

۳۲ قوم سبا کی تاریخ کی طرف یہ اشارات جو قرآن مجید میں کیے گئے ہیں ان کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ معلومات بھی ہماری نگاہ میں رہیں جو اس قوم کے متعلق دوسرے تاریخی ذرائع سے فراہم ہوئی ہیں۔

تاریخ کی رُو سے "سبا" جنوبی عرب کی ایک بہت بڑی قوم کا نام ہے جو چند بڑے بڑے قبائل پر مشتمل تھی۔ امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن عبدالبر اور ترمذی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سبا عرب کے ایک شخص کا نام تھا جس کی نسل سے عرب میں حسب

ذیل قبیلے پیدا ہوئے: کِنْدَہ، حِمْیَر، اَزْد، اَشْعَرِیِّین، مَذْحِج، اَنمار (جس کی دو شاخیں ہیں، خَثْعَم اور بَجِیلَہ)، عَامِلَہ، جُذَام، لَخْم اور غَسّان۔

بہت قدیم زمانے سے دنیا میں عرب کی اس قوم کا شہرہ تھا۔ ۲۵۰۰ سنہ قبل مسیح میں اُور کے کتبات اس کا ذکر سابوم کے نام سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابل اور آشور (اسیریا) کے کتبات میں اور اسی طرح بائیبل میں بھی کثرت سے اس کا ذکر آیا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو زبور، ۷۲: ۱۵۔ یرمیاہ ۶: ۲۰۔ حزقی ایل ۲۷: ۲۲۔ ۳۸: ۱۳۔ ایوب ۶: ۱۹)۔ یونان و روم کے مورخین و جغرافیہ نویس تھیو فراسٹس (۲۸۸ سنہ ق م) کے وقت سے مسیح کے بعد کئی صدیوں تک مسلسل اس کا ذکر کرتے چلے گئے ہیں۔

اس کا وطن عرب کا جنوبی مغربی کونہ تھا جو آج یمن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے عروج کا دور گیارہ سو برس قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں ایک دولت مند قوم کی حیثیت سے اس کا شہرہ آفاق میں پھیل چکا تھا۔ آغاز میں یہ ایک آفتاب پرست قوم تھی۔ پھر جب اس کی ملکہ حضرت سلیمان (۹۶۵ ۔ ۹۲۶ سنہ ق م) کے ہاتھ پر ایمان لے آئی تو غالب یہ ہے کہ اس کی غالب اکثریت مسلمان ہو گئی تھی۔ لیکن بعد میں نہ معلوم کس وقت اس کے اندر شرک و بت پرستی کا پھر زور ہو گیا اور اس نے اَلْمَقَہ (چاند دیوتا)، عَشْتَر (زہرہ)، ذات حَمِیم اور ذات بعدان (سورج دیوی)، ہوبس، حرمتم یا حرمیت اور ایسے ہی دوسرے بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ اَلْمَقَہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا تھا اور اس کے بادشاہ اپنے آپ کو اسی دیوتا کے وکیل کی حیثیت سے اطاعت کا حق دار قرار دیتے تھے۔ یمن میں بکثرت کتبات ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا ملک ان دیوتاؤں، اور خصوصاً اَلْمَقَہ کے مندروں سے بھرا ہوا تھا اور ہر اہم واقعہ پر ان کے شکریے ادا کیے جاتے تھے۔

آثارِ قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں یمن سے تقریباً ۳ ہزار کتبات فراہم ہوئے ہیں جو اس قوم کی تاریخ پر اہم روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ عربی روایات اور رومی و یونانی تواریخ کی فراہم کردہ

معلومات کو اگر جمع کر لیا جائے تو اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ اس کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔
ان معلومات کی رُو سے اس کی تاریخ کے اہم ادوار حسبِ ذیل ہیں:

(۱) ۶۵۰ ق م سے پہلے کا دَور۔ اس زمانے میں ملوک سبا کا لقب مُکَرِّب سبا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ لفظ مُقَرِّب کا ہم معنی تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بادشاہ انسانوں اور خداؤں کے درمیان اپنے آپ کو واسطہ قرار دیتے تھے، یا دوسرے الفاظ میں یہ کاہن بادشاہ (PRIEST KINGS) تھے۔ اس زمانے میں ان کا پایۂ تخت صرواح تھا جس کے کھنڈر آج بھی مارِب سے مغرب کی جانب ایک دن کی راہ پر پائے جاتے ہیں اور خَرِبہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی دَور میں مارب کے مشہور بند کی بنا رکھی گئی اور وقتاً فوقتاً مختلف بادشاہوں نے اسے وسیع کیا۔

(۲) ۶۵۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک کا دور۔ اس دَور میں سبا کے بادشاہوں نے مکرِّب کا لقب چھوڑ کر مَلِک (بادشاہ) کا لقب اختیار کر لیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت میں مذہبیت کی جگہ سیاست اور سیکولرزم کا رنگ غالب ہو گیا۔ اس زمانے میں ملوکِ سبا نے صرواح کو چھوڑ کر مارب کو اپنا دار السلطنت بنایا اور اسے غیر معمولی ترقی دی۔ یہ مقام سمندر سے ۳۹۰۰ فیٹ کی بلندی پر صنعاء سے ۶۰ میل جانبِ مشرق واقع ہے اور آج تک اس کے کھنڈر شہادت دے رہے ہیں کہ کبھی یہ ایک بڑی متمدن قوم کا مرکز تھا۔

(۳) ۱۱۵ ق م سے ۳۰۰ء تک کا دَور۔ اس زمانے میں سبا کی مملکت پر حِمیَر کا قبیلہ غالب ہو گیا جو قومِ سبا ہی کا ایک قبیلہ تھا اور تعداد میں دوسرے تمام قبائل سے بڑھا ہوا تھا۔ اس دَور میں مارب کو اجاڑ کر رَیدان پایۂ تخت بنایا گیا جو قبیلۂ حِمیَر کا مرکز تھا۔ بعد میں یہ شہر ظَفار کے نام سے موسوم ہوا۔ آج کل موجودہ شہر یریم کے قریب ایک مدوّر پہاڑی پر اس کے کھنڈر ملتے ہیں اور اسی کے قریب علاقہ میں ایک چھوٹا سا قبیلہ حِمیَر کے نام سے آباد ہے جسے دیکھ کر کوئی شخص تصوّر تک نہیں کر سکتا کہ یہ اُسی قوم کی یادگار ہے جس کے ڈنکے کبھی دنیا بھر میں بجتے تھے۔ اسی زمانے میں سلطنت کے ایک حصّہ کی حیثیت سے پہلی مرتبہ لفظ یمنت، اور یمنات، کا لفظ استعمال ہونا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ

یمن اس پورے علاقے کا نام ہو گیا جو عرب کے جنوبی مغربی کونے پر عسیر سے عدن تک اور باب المندب سے حضر موت تک واقع ہے۔ یہی دور ہے جس میں سبائیوں کا زوال شروع ہوا۔

(۴) سنہ ۳۰۰ء کے بعد سے آغازِ اسلام تک کا دور یہ قوم سبا کی تباہی کا دور ہے۔ اس دور میں ان کے ہاں مسلسل خانہ جنگیاں ہوئیں۔ بیرونی قوموں کی مداخلت شروع ہوئی۔ تجارت برباد ہوئی۔ زراعت نے دم توڑا۔ اور آخر کار آزادی تک ختم ہو گئی۔ پہلے ریدانیوں، حمیریوں، اور ہمدانیوں کی باہمی نزاعات سے فائدہ اٹھا کر سنہ ۳۴۰ء سے سنہ ۳۷۸ء تک یمن پر حبشیوں کا قبضہ رہا۔ پھر آزادی تو بحال ہو گئی مگر مارب کے مشہور بند میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے یہاں تک کہ آخر کار سنہ ۴۵۰ء یا سنہ ۴۵۱ء میں بند کے ٹوٹنے سے وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر اوپر قرآن مجید کی آیات میں کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد ابرہہ کے زمانے تک اس بند کی مسلسل مرمتیں ہوتی رہیں، لیکن جو آبادی منتشر ہو چکی تھی وہ پھر جمع نہ ہو سکی اور نہ آب پاشی اور زراعت کا وہ نظام جو درہم برہم ہو چکا تھا، دوبارہ بحال ہو سکا۔ سنہ ۵۲۳ء میں یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے نجران کے عیسائیوں پر وہ ظلم و ستم برپا کیا جس کا ذکر قرآن مجید میں اصحاب الاخدود کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں حبش کی عیسائی سلطنت یمن پر انتقاماً حملہ آور ہو گئی اور اس نے سارا ملک فتح کر لیا۔ اس کے بعد یمن کے حبشی وائسرائے ابرہہ نے کعبہ کی مرکزیت ختم کرنے اور عرب کے پورے مغربی علاقے کو رومی۔ حبشی اثر میں لانے کے لیے سنہ ۵۷۰ء یا سنہ ۵۷۱ء میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے چند روز قبل، مکہ معظمہ پر حملہ کیا اور اس کی پوری فوج پر وہ تباہی آئی جسے قرآن مجید میں اصحاب الفیل کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ آخر کار سنہ ۵۷۵ء میں یمن پر ایرانیوں کا قبضہ ہوا اور اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب سنہ ۶۲۸ء میں ایرانی گورنر باذان نے اسلام قبول کر لیا۔

قوم سبا کا عروج دراصل دو بنیادوں پر قائم تھا۔ ایک زراعت۔ دوسرے تجارت۔ زراعت کو انھوں نے آب پاشی کے ایک بہترین نظام کے ذریعہ سے ترقی دی تھی جس کے مثل کوئی دوسرا نظامِ آب پاشی بابل کے سوا قدیم زمانہ میں کہیں نہ پایا جاتا تھا۔ ان کی سرزمین میں قدرتی دریا نہ تھے۔

بارش کے زمانے میں پہاڑوں سے برساتی نالے بہ نکلتے تھے۔ انہی نالوں پر سارے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر انہوں نے تالاب بنا لیے تھے اور ان سے نہریں نکال نکال کر پورے ملک کو اس طرح سیراب کر دیا تھا کہ قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق ہر طرف ایک باغ ہی باغ نظر آتا تھا۔ اس نظام آب پاشی کا سب سے بڑا مخزنِ آب وہ تالاب تھا جو شہر مارب کے قریب کوہ بلق کی درمیانی وادی پر بند باندھ کر تیار کیا گیا تھا۔ مگر جب اللہ کی نظرِ عنایت ان سے پھر گئی، تو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں یہ عظیم الشان بند ٹوٹ گیا اور اس سے نکلنے والا سیلاب راستے میں بند پر بند توڑتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ملک کا پورا انتظام آب پاشی تباہ ہو کر رہ گیا۔ پھر کوئی اسے بحال نہ کر سکا۔

تجارت کے لیے اس قوم کو خدا نے بہترین جغرافی مقام عطا کیا تھا جس سے اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک یہی قوم مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا واسطہ بنی رہی۔ ایک طرف ان کے بندرگاہوں میں چین کا ریشم، انڈونیشیا اور مالابار کے گرم مسالے، ہندوستان کے کپڑے اور تلواریں، مشرقی افریقہ کے زنگی غلام، بندر، شتر مرغ کے پر اور ہاتھی دانت پہنچتے تھے اور دوسری طرف یہ ان چیزوں کو مصر اور شام کی منڈیوں میں پہنچاتے تھے جہاں سے روم و یونان تک یہ مال روانہ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خود ان کے علاقے میں لوبان، عود، عنبر، مشک، مُر، قرفہ، قصب الذریرہ، سَلیخہ اور دوسری اُن خوشبو دار چیزوں کی بڑی پیداوار تھی جنہیں مصر و شام اور روم و یونان کے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

اس عظیم الشان تجارت کے دو بڑے راستے تھے۔ ایک بحری۔ دوسرا برّی۔ بحری تجارت کا اجارہ ہزار سال تک انہی سبائیوں کے ہاتھ میں تھا، کیونکہ بحر احمر کی موسمی ہواؤں، زیر آب چٹانوں اور لنگر اندازی کے مقامات کا راز یہی لوگ جانتے تھے اور دوسری کوئی قوم اس خطرناک سمندر میں جہاز چلانے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ اس بحری راستے سے یہ لوگ اردن اور مصر کی بندرگاہوں تک اپنا مال پہنچایا کرتے تھے۔ برّی راستے عدن اور حضرموت سے مارب پر جا کر ملتے تھے اور پھر وہاں سے ایک شاہراہ مکہ، جدہ، یثرب، العُلاء، تبوک اور اَیلہ سے گزرتی ہوئی پٹرا تک پہنچتی تھی

اس کے بعد ایک راستہ مصر کی طرف اور دوسرا راستہ شام کی طرف جاتا تھا۔ اس بری راستے پر، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے، یمن سے حدودِ شام تک سبائیوں کی نوآبادیاں مسلسل قائم تھیں اور شب و روز ان کے تجارتی قافلے یہاں سے گزرتے رہتے تھے۔ آج تک ان میں سے بہت سی نوآبادیوں کے آثار اس علاقے میں موجود ہیں اور وہاں سبائی و حمیری زبان کے کتبات مل رہے ہیں۔

پہلی صدی عیسوی کے لگ بھگ زمانے میں اس تجارت پر زوال آنا شروع ہو گیا۔ مشرق اوسط میں جب یونانیوں اور پھر رومیوں کی طاقتور سلطنتیں قائم ہوئیں تو شور مچنا شروع ہوا کہ عرب تاجر اپنی اجارہ داری کے باعث مشرق کے اموالِ تجارت کی من مانی قیمتیں وصول کر رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ ہم خود اس میدان میں آگے بڑھ کر اس تجارت پر قبضہ کریں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلے مصر کے یونانی الاصل فرمانروا بطلیموس ثانی (۲۸۵ء-۲۴۶ء ق م) نے اُس قدیم نہر کو پھر سے کھولا جو ۱۷ سو برس پہلے فرعون سیسوسٹریس نے دریائے نیل کو بحر احمر سے ملانے کے لیے کھدوائی تھی۔ اس نہر کے ذریعہ سے مصر کا بحری بیڑا پہلی مرتبہ بحر احمر میں داخل ہوا۔ لیکن سبائیوں کے مقابلے میں یہ کوشش زیادہ کارگر نہ ہو سکی۔ پھر جب مصر پر روم کا قبضہ ہوا تو رومی زیادہ طاقتور تجارتی بیڑا بحر احمر میں لے آئے اور اس کی پشت پر انہوں نے ایک جنگی بیڑا بھی لا کر ڈال دیا۔ اس طاقت کا مقابلہ سبائیوں کے بس میں نہ تھا۔ رومیوں نے جگہ جگہ بندرگاہوں پر اپنی تجارتی نوآبادیاں قائم کیں، ان میں جہازوں کی ضروریات فراہم کرنے کا انتظام کیا، اور جہاں ممکن ہوا وہاں اپنے فوجی دستے بھی رکھ دیئے۔ حتیٰ کہ ایک وقت وہ آ گیا کہ عدن پر رومیوں کا فوجی تسلط قائم ہو گیا۔ اسی سلسلے میں رومی اور حبشی سلطنتوں نے سبائیوں کے مقابلے میں باہم ساز باز بھی کر لیا جس کی بدولت بالآخر اس قوم کی آزادی تک ختم ہو گئی۔

بحری تجارت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد صرف بری تجارت سبائیوں کے پاس رہ گئی تھی۔ مگر بہت سے اسباب نے رفتہ رفتہ اس کی کمر بھی توڑ دی۔ پہلے نبطیوں نے پیٹرا سے العلا تک بالائی حجاز اور اردن کی تمام نوآبادیوں سے سبائیوں کو نکال باہر کیا۔ پھر ۱۰۶ء میں رومیوں نے نبطی

سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور حجاز کی سرحد تک شام و اردن کے تمام علاقے ان کے مضبوط ہاتھوں میں چلے گئے۔ اس کے بعد حبش اور روم کی متحدہ کوشش یہ رہی کہ سبائیوں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر ان کی تجارت کو بالکل تباہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر حبشی بار بار یمن میں مداخلت کرتے رہے یہاں تک کہ آخر کار انہوں نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے غضب نے اس قوم کو انتہائی عروج سے گرا کر اس گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے پھر کوئی مغضوب قوم کبھی سر نہیں نکال سکی ہے۔ ایک وقت تھا کہ اس کی دولت کے افسانے سن سن کر یونان و روم والوں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ اسٹرابو لکھتا ہے کہ یہ لوگ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے ہیں، اور ان کے مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور دروازوں تک میں ہاتھی دانت، سونے، چاندی اور جواہر کا کام بنا ہوا ہوتا ہے۔ پلینی کہتا ہے کہ روم اور فارس کی دولت ان کی طرف بہی چلی جا رہی ہے، یہ اس وقت دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم ہیں۔ اور ان کا سرسبز و شاداب ملک باغات، کھیتیوں اور مواشی سے بھرا ہوا ہے۔ آرٹی میڈورس کہتا ہے کہ یہ لوگ عیش میں مست ہو رہے ہیں اور جلانے کی لکڑی کے بجائے دارچینی، صندل اور دوسری خوشبودار لکڑیاں جلاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے یونانی مورخین روایت کرتے ہیں کہ ان کے علاقے کے قریب سواحل سے گزرتے ہوئے تجارتی جہازوں تک خوشبو کی لپٹیں پہنچتی ہیں۔ انہوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ صنعاء کے بلند پہاڑی مقام پر وہ فلک شگاف عمارت (SKYSCRAPER) تعمیر کی جو قصر غُمدان کے نام سے صدیوں تک مشہور رہی ہے۔ عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ اس کی ۲۰ منزلیں تھیں اور ہر منزل ۳۶ فیٹ بلند تھی۔ یہ سب کچھ بس اسی وقت تک رہا جب تک اللہ کا فضل ان کے شاملِ حال رہا۔ آخر کار جب انہوں نے کفرانِ نعمت کی حد کر دی تو ربِّ قدیر کی نظرِ عنایت ہمیشہ کے لیے ان سے پھر گئی اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

بحیثیت داعی الی الحق

جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب

(یہ تقریر پروفیسر صاحب نے ۲ اگست ۱۹۶۲ء کو کراچی ریڈیو اسٹیشن سے نشر فرمائی تھی)

انسان بنیادی طور پر دو ایسی ضروریات کا محتاج ہے جن سے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ ایک طرف اسے ان اشیاء و وسائل کی ضرورت درپیش ہے جو اس کی مادی احتیاجات کو پورا کریں، جن کے ذریعہ اپنے جسم اور روح کے رشتے کو قائم و استوار کرے اور بقائے حیات کے مادی تقاضوں کو پورا کرے۔ دوسری طرف وہ اس ہدایت اور رہنمائی کا محتاج ہے جس کی روشنی میں وہ اپنی اخلاقی، اجتماعی اور تمدنی زندگی کی تشکیل صحت مند بنیادوں پر کر سکے اور اس طرح انسانیت کے حقیقی مقاصد کی بوجہِ احسن تکمیل کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کی ربوبیتِ عامہ کا تقاضا ہے کہ وہ انسان کی ان دونوں ضرورتوں کو پورا کرے۔ پہلی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس نے زمین و آسمان میں وسائلِ معیشت کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ودیعت کر دیا ہے اور انسان ان وسائل کے ذریعہ اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔ پوری کائنات انسان کے لیے اپنا دامن پھیلائے ہوئے ہے اور اپنے سینے سے وہ وسائل اگل رہی ہے جو انسانیت کی بے شمار اور ہر آن بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو بحسن و خوبی پورا کر رہے ہیں۔

دمادم رواں ہے یمِ زندگی
ہر اک شئے سے پیدا رمِ زندگی

انسان کی دوسری بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت اور اپنے نبی مبعوث فرمائے تاکہ وہ انسان کو زندگی کی حقیقت سے روشناس کرائیں۔ انہیں زندگی کے معنیٰ اور اس کے مقاصد سے آشنا کریں، انہیں جینے کے طریقے سکھائیں اور ان اصول تمدن کی تعلیم دیں جو زندگی کو اس کے اصل مقاصد سے ہمکنار کر دیں اور خدا کی زمین پر ایک صحت مند نظام قائم کریں جس میں زمین اپنی نعمتیں اُگل دے اور آسمان اپنی برکتیں نازل کرنے لگے۔

انبیاء کی بعثت کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ خدا اور بندے کے تعلق کو توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد کی بنیادوں پر استوار کرائیں اور دعوتِ دین اور اجتماعی جدوجہد کے ذریعہ تاریخ کی رو کو موڑ دیں اور الہامی ہدایت کی روشنی میں انفرادی، اور اجتماعی زندگی کی تعمیر کریں۔ سورۃ الحدید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنَاتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتَابَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ	ہم نے اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ قرآن (یعنی قانونِ حیات)، اور میزانِ عدل اُتاری تاکہ انسانوں پر انصاف قائم کریں۔

سورۃ الصف میں ربّ السموات والارض کا ارشاد ہے:

ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ	وہی ہے (ذات باری تعالیٰ) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام نظامہائے زندگی پر غالب کر دے۔

——— یہ ہے انبیاء کا مشن! اور یہی وجہ ہے کہ نبی کی جو حیثیت اس کی تمام حیثیتوں سے نمایاں اور ممتاز ہے وہ داعی الی الحق کی حیثیت ہے۔ اسلام کا اصل مقصد انسانی زندگی کو ایک خاص نہج پر چلانا ہے۔ اسلام کوئی پوجا پاٹ کا جامد نظام نہیں بلکہ ایک زندہ اور متحرک تحریکِ فکر و عمل ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ہدایت الٰہی کا پابند بناتی ہے۔ اسلام ایک دعوت

ہے جو انسانوں کو خدا کے دین کی طرف بلاتی اور ان کی زندگیوں کو نورِ الٰہی سے منور کرتی ہے۔ اسلام ایک مکمل دین، ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کی تمام وسعتوں پر حاکمیتِ الٰہی قائم کرنے کا دعویدار ہے۔ انبیاء وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جو اس دعوت کے داعی اور اس تحریک کے قائد ہیں اور جن کی رہنمائی میں یہ اصلاحی جدوجہد برپا ہوئی اور جس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

قرآن پاک آپ کی بعثت کا مقصد اس چیز کو قرار دیتا ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔

وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے (یعنی حضرت محمدؐ کو پیغمبر بنا کر بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے، ان کا تزکیہ کرتے اور خدا کی کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور اس سے پہلے تو یہ صریح گمراہی میں تھے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (مائدہ - ۶۷)

اے رسول، جو حق تم پر تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے اس کی تبلیغ کرو۔

فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ (شوریٰ)

پس اسی راہ کی دعوت دو اور اس پر استقامت کے ساتھ جمے رہو جس طرح کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔

ان آیاتِ ربانی سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی حیثیت داعی کی حیثیت ہے۔ آپ کا اصل مشن یہ تھا کہ خدا کی ہدایت لوگوں تک پہنچا دیں، انہیں خدا کی کتاب اور حکمت و دانش کی تعلیم دیں اور انہیں دعوت دیں کہ وہ دین کو اپنی پوری زندگی پر غالب کر دیں۔ پھر جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہیں انہیں ایک تحریک اور ایک امت میں منظم کریں، ان کے اخلاق کا تزکیہ کریں، ان میں کردار کے جوہر پیدا کریں اور اجتماعی جدوجہد کے ذریعہ اپنی قیادت و رہنمائی میں وہ تہذیب و تمدن قائم کریں جو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اسلام فکر و نظر اور علم و عمل میں ایک ہمہ گیر

انقلاب کا داعی ہے۔ وہ انسان کو غیر اللہ کی ہر غلامی سے نجات دلا کر اس کی زندگی کو خدا کے لیے خالص کرنا چاہتا ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ پر، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، سماجی ہو یا سیاسی، معاشی ہو یا معاشرتی، قومی ہو یا بین الاقوامی خدا کی حاکمیت قائم کرو۔ ہر اطاعت پر خدا کی اطاعت اور ہر قانون پر خدا کا قانون مقدم ہے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت حاکمیتِ الٰہی کی دعوت تھی اور آپ کی سیرت پاک کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے دعوتِ اسلامی کے کام کو باقی تمام کاموں پر مقدم رکھا اور ہر دور اور ہر حالت میں اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف رہے۔ آپؐ اول بھی داعی تھے اور آخر بھی داعی ــ اور صرف داعی الی اللہ ــ آیئے آپؐ کی دعوتی زندگی کے چند اہم پہلوؤں کا مطالعہ کریں تاکہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو آپ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں ادا کرنے کی کوشش کر سکیں۔ اس لیے کہ داعی الی الحق کی جو ذمہ داری آپ کے مبارک شانوں پر تھی اب وہ پوری امتِ مسلمہ کے کندھوں پر ہے۔

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ ۔ تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور
وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (الحج) تم لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو۔

یعنی جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حق کی شہادت اور گواہی دی اب اسی طرح پوری امت کو تمام انسانیت کے سامنے اس حق کی شہادت دینی ہے۔

۱۔ آپؐ کی دعوتی زندگی کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ جو تعلیم آپ نے دنیا کو دی اس پر سب سے پہلے ایمان لانے والے آپ خود تھے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۔ رسول اس پر ایمان لائے جو رب کی طرف سے اُن پر نازل کیا گیا اور تمام مومن بھی۔

آپ اس ہدایت پر سب سے پہلے ایمان لانے والے اور اپنی زندگی کو سب سے پہلے اس کے تابع کرنے والے تھے۔ اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں۔ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ میں سب سے پہلا مسلم ہوں۔

جو دعوت آپؐ نے دی آپ کی پوری زندگی اس کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ بقول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کی زندگی سراپا قرآن تھی۔ دنیا میں بے شمار مُصلح اور فلسفی آئے۔ جو گفتار کے غازی تو ضرور تھے مگر کردار کے غازی نہ تھے۔ جو تعلیم انہوں نے دی وہ خود اس پر عامل نہ تھے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ آپ نے اپنی دعوت کے ہر پہلو پر خود عمل کر کے دکھا دیا اور انسانیت کے لیے بہترین نمونہ پیش فرمایا تاکہ لوگ صرف آپ کے ارشادات ہی سے ہدایت حاصل نہ کریں بلکہ آپ کے افعال و اعمال کی بھی پیروی کریں اور زندگی کا کوئی گوشہ اور قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا باقی نہ رہے جس پر آپ کے سیرت و کردار کی گہری چھاپ موجود نہ ہو۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃ حسنۃ

۲۔ دوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ آپؐ نے جزوی اصلاح کے مقابلے میں کُلّی انقلاب کی جدوجہد کی۔ آپؐ کا مقصد چند جزئیات میں تبدیلی پیدا کرنا نہ تھا بلکہ پوری زندگی کو ہدایتِ الٰہی کے مطابق استوار کرنا تھا۔ آپ نے لوگوں کے خیالات اور نظریات کی اصلاح کی اور انہیں ایک ایمان اور جوشِ زندگی بخشا۔ آپؐ نے ان کے اخلاق و کردار کو سنوارا اور ایک نیا انسان پیدا کیا۔ آپ نے تمدن و معاشرت کی اصلاح فرمائی اور ایک نئی سوسائٹی کی تعمیر کی۔ آپؐ نے طاغوت کو زندگی کے ہر میدان میں شکست فاش دی اور پھر وہاں حاکمیتِ الٰہی کے تخت بچھائے۔ یہ ایک ہمہ گیر انقلاب تھا اور انسانی تاریخ کا وہ واحد انقلاب ہے جس نے انسانیت کی پوری زندگی کی اصلاح و تعمیر کی۔

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حضور سرورِ کائنات کو دین کی فتح و کامرانی اور اس کی سربلندی پر ہمیشہ گہرا اور غیر متزلزل یقین رہا۔ عین اُن پُر آشوب حالات میں جب مسلمانوں کی کشتی مخالفت کے طوفانوں میں گھری ہوئی تھی اور دور دور ساحل کا کہیں نام و نشان نہ ملتا تھا اور روشنی کی کوئی رمق موجود نہ تھی

اُس وقت بھی قطعاً مایوس نہ ہوئے۔ مکی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ مسلمان قریش کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے، ہر مسلمان کی جان خطرہ میں تھی۔ صبح ہوتی تھی شام کا بھروسہ نہ تھا اور شام ہوتی تھی تو صبح کا یقین نہ تھا۔ بظاہر اسلام کا کوئی مستقبل نظر نہ آرہا تھا اور جو دن گزرتا تھا غنیمت معلوم ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں ایک مظلوم مسلمان حضرت خبابؓ آپؐ کے پاس آئے۔ آپؐ بیت اللہ کے سامنے بیٹھے تھے۔ حضرت خبابؓ نے کہا: یا رسول اللہ! اب تو پانی سر سے گزرا جا رہا ہے۔ آپؐ ہمارے لیے دعا کیجیے۔" آنحضرت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آپؐ نے فرمایا "بس خبابؓ! گھبرا گئے۔ پہلی امتوں میں تو یہ ہوا کہ مومن کو گڑھا کھود کر گاڑ دیا گیا اور سر پر آرہ چلایا گیا یہاں تک کہ اس کے بدن کے دو ٹکڑے ہو کر گر گئے اور لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا مگر اس کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہ آئی۔ خدا کی قسم اللہ اپنے دین کو مکمل کرے گا یہاں تک کہ (اس دین کی عمومیت اور غلبہ) کا یہ حال ہو گا کہ سوار صنعاء سے حضر موت تک سینکڑوں میل کی مسافت طے کرتا چلا جائے گا اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا کھٹکا نہ ہو گا سوائے اس کے کہ اس کو بھیڑیئے سے خطرہ ہو کہ وہ اس کی بکریوں پر حملہ کرے ــ لیکن تم جلدی بہت کرتے ہو۔"

یہ واقعہ کئی حیثیت سے بڑا اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی کو اپنی دعوت پر کتنا اعتماد ہے کہ بڑی سے بڑی مشکل اور آزمائش کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی عمومیت اور غلبہ کا مقصد اپنے تمام تضمنات کے ساتھ اس کے سامنے اس وقت بھی تھا جب غلبہ و حکمرانی بظاہر ناممکن نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داعی استقامت کے اس مقام پر ہوتا ہے جہاں سے کوئی چیز اس کے ارادہ کو متزلزل نہیں کر سکتی

۳۔ تیسری چیز ہمیں یہ نظر آتی ہے کہ آپ نے بعثت سے لیکر اپنے آخری سانس تک دین کی دعوت کو پھیلانے کی کوشش اس انہماک اور تندہی سے کی کہ اس کی نظیر تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے۔ آپ کا ہر لمحہ اسی فکر میں بسر ہوتا تھا کہ کسی طرح ہر اک پیغام خدا کے

بندوں تک پہنچائیں اور ان کو جہنم کی آگ اور دنیا کے خسران سے بچائیں۔ یہ فکر آپ کو اس درجہ دامن گیر رہتی تھی کہ ایک مرتبہ آپؐ دن بھر کی تبلیغی جدوجہد اور دشمنوں کی اذیت رسانی سے چُور ہو کر رات کو تھکے ہارے گھر واپس آتے۔ بدن بخار سے تپ رہا تھا اور آپ چند منٹ کے لیے لیٹ گئے۔ اتنے میں اطلاع ملی کہ مکہ سے چند میل پر ایک پہاڑی کے نیچے ایک قافلہ آکر رُکا ہے۔ یہ سنتے ہی آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ ان تک خدا کا پیغام پہنچائیں، لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ بہت تھکے ہوئے ہیں قافلہ والوں سے کل صبح مل لیں" آپؐ نے فرمایا "کیا معلوم صبح تک مجھے موت آجائے یا وہ قافلہ راتوں رات کہیں اور چلا جائے اور اس صورت میں میرا فرض نامکمل رہ جاتے۔" دیکھیے دعوتِ اسلامی کے کام کو حضورؐ کتنی اہمیت دیتے ہیں اور فرض کی بجا آوری کو کیا مقام آپ نے دیا۔ فرض شناسی کی یہ مثال ہمارے لیے روشنی کا مینار ہے۔

۴۔ پھر آپ کی دعوتی زندگی کا یہ بھی ایک نمایاں پہلو ہے کہ آپ نے ہر مرحلے اور ہر دور کے حالات کے مطابق دعوتِ دین کی راہیں نکالیں اور ہر زمانہ میں نہایت حکمت و دانشمندی کے ساتھ کلمۂ حق کا اظہار کیا اور بالآخر دینِ حق کو قائم کیا۔ بعثت کے فوراً بعد خاموشی کے ساتھ آپ نے اپنی دعوت کا آغاز کر دیا اور قریبی حلقوں میں دین کا پیغام پہنچانا شروع کیا۔ بعثت کے تیسرے سال جب دعوت عام کی اجازت ملی تو آپ نے تمام قریش کو فاران پر جمع کیا اور اسلام کی دعوت ان تک پہنچائی۔ پھر معززین قبیلہ کو خصوصی دعوت دی اور کھانے پر بلا کر ان کو خدا کے کلام سے آگاہ کیا۔ آپ ایک ایک قبیلہ، ایک ایک خاندان، ایک ایک گروہ اور ایک ایک فرد تک پہنچے اور ان کو اسلام سے روشناس کرایا، نجی گفتگوئیں، مکالمات و مذاکرات، تقریر و وعظ الغرض ہر ممکن طریق سے اسلامی تعلیمات اُن کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی اور جب تک دعوت کی راہیں کھلی رہیں۔ آپ برابر حق کی طرف برملا بلاتے رہے اور جب کھلے بندوں تبلیغ کا امکان نہ رہا تو خاموشی سے نجی ملاقاتوں کے ذریعہ اپنے مشن کی تبلیغ کرتے رہے۔

جب آپؐ کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا تو آپ خاموشی کے ساتھ جن جن مقامات پر جا سکتے تھے اس زمانہ میں بھی ان مقامات پر دعوت پہنچانے سے آپ نہ رکے۔ پھر جب مکہ میں دعوت کے مزید پھیلانے کا امکان نہ رہا تو آپؐ نے مکہ سے باہر جا کر دعوت و تبلیغ کا کام انجام دیا۔ میلوں اور جلسوں کے موقع پر باہر کے قبائل سے ملے۔ طائف کا سفر کیا اور دوسرے بیرونی قبائل کو اپنی دعوت کی طرف بلایا حتیٰ کہ بیرونی قبائل میں اس کوشش ہی کے نتیجہ میں اسلامی دعوت کا نیا مرکز مل گیا اور اہلِ مکہ کی سختی اور ان کا تشدد ذریعہ بنے دینِ حق کے نئے مرکز۔ مدینۃ الرسول۔ کے قیام اور اس کے ذریعہ بالآخر دعوتِ اسلامی کے غلبہ کا :

پھر مدینہ میں جب قوت و اقتدار اسلام کو حاصل ہو گیا تو آپؐ نے ریاست کی تمام طاقتیں دعوتِ اسلامی کے فروغ کے لیے وقف کر دیں۔ ایک طرف مدینہ میں اسلامی ریاست قائم کی اور دوسری طرف اس ریاست کے ذریعہ تمام عرب اور بالآخر پوری دنیا کو اسلام کی دعوت دی۔

۵۔ پھر آپ کی زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ اسلامی کا لازمی تقاضا ہے کہ ہر کونے اور جہت سے اس کی مخالفت کی جائے اور مخالفت کی نت نئی صورتیں نکالی جائیں۔ آپؐ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ آپ کے راستہ میں کانٹے بچھائے گئے۔ آپؐ کو سب وشتم کا نشانہ بنایا گیا، آپ کے متعلق افواہیں پھیلائی گئیں، آپؐ پر پتھر پھینکے گئے، آپ کو زدوکوب کیا گیا، آپؐ کے گلے میں پھندا ڈال کر کھینچا گیا۔ عین عالمِ سجدہ میں آپ کی پیٹھ پر اونٹ کی اوجھڑی تک رکھ دی گئی ـــــ آپؐ کے ساتھیوں کو آگ پر لٹایا گیا، ریت پر گھسیٹا گیا، پتھر کی سلوں کے نیچے دبایا گیا۔ اتنا مارا گیا کہ وہ شہید ہو گئے ـــــ لیکن ہر حال میں آپؐ ثابت قدم رہے، آپؐ نے دعوتِ اسلامی کا کام جاری رکھا اور راہ کی کوئی مشکل اور مصیبتوں کا کوئی طوفان آپؐ کی پیش قدمی کو نہ روک سکا۔ اسی طرح کوئی لالچ اور کوئی ترغیب خواہ وہ دولت کی ہو یا سرداری کی یا بادشاہت کی، آپؐ کو اپنے مشن سے ہٹا نہ سکی اور ہر حالت میں آپؐ نے کہا

تو یہی کہا:

”خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ کر کہیں کہ مہر و ماہ کے عوض میں تبلیغ دین کا کام ترک کر دوں تو مجھے منظور نہیں — اگر اس راہ میں مجھے ہلاکت نظر آئے تب بھی میں پیچھے نہ لوٹوں گا — حتیٰ کہ یہ مشن کامیاب ہو یا میں اس میں کام آجاؤں . . “

یہ تھا داعی کا عزم! اور سچ ہے کہ داعی اگر اپنے مشن میں سچا اور اپنی دھن کا پکا ہو تو انہی مشکلات سے کامیابی کی راہیں پھوٹیں گی اور دینِ حق فاتح و کامران ہو گا۔ جس طرح کلی کی موت ہی کے بعد پھول خندہ زن ہو سکتا ہے اور جس طرح آگ کے جلے بغیر روشنی اور حرارت ممکن نہیں اسی طرح آزمائش اور ابتلاء کے بغیر دعوتِ حق کی کامیابی کا امکان نہیں۔ فتح مکہ کی منزل شعبِ ابی طالب کی گرفتاری، طائف کی ہزیمت اور بدر و اُحُد کی خوں پاشی کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے اور یہی فطرت کا قانون ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ اور تم خدا کے طریقے میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔

کوائف مدارسِ عربیہ مغربی پاکستان

(دینی مدارس کی تاریخ اور جائزہ)

مغربی پاکستان کے دینی مدارس کی تاریخ اور جائزہ اعداد و شمار ساڑھے آٹھ سو (۸۵۰) صفحات پر مشتمل کتاب پہلی بار دو سال قبل شائع ہوئی تھی۔ ملک اور بیرونِ ملک میں بندہ کی اس خدمت کو سراہا گیا۔ اُس وقت دو سو (۲۰۰) صد کے قریب مدارس کے کوائف مہیا نہ ہوئے تھے۔ دو سال کے دوران نئے مدارس قائم ہو گئے ہیں۔ اس عرصہ میں کچھ قدیم مدارس نے بھی ترقی کے کئی مراحل طے کر لیے ہیں۔ ان حالات میں ضروری ہو گیا کہ تمام قدیم و جدید مدارس کی تاریخ از سرِ نو مرتب کر دوں جن مدارس کے پتے معلوم ہو سکے اس مقصد کے لیے انہیں تیرہ صد (۱۳۰۰) کے قریب سوالنامے روانہ کر چکا ہوں جنہیں نہ ملے ہوں اس پتے سے بلا قیمت طلب فرمائیں: حافظ نذر احمد۔ نذر منزل ۱۸ محمد نگر۔ علامہ اقبال روڈ لاہور

مارکسی تثلیث

(از: چوہدری علی احمد خان مرحوم)

[چوہدری علی احمد خاں مرحوم و مغفور تحریک اسلامی کے صفِ اوّل کے کارکن تھے۔ اس ملک میں احیائے اسلام کی جب کبھی تاریخ مرتب کی جائے گی تو وہ چودھری صاحب مرحوم کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے ذکر سے کبھی خالی نہ ہوگی۔ اُن کی پُرکشش شخصیت، وسعتِ علمی اصابتِ رائے، سیاسی فہم و فراست اور مقصد کے ساتھ والہانہ عشق کا ایک حسین امتزاج تھی۔ اشتراکیت پر اُن کی نظر خصوصاً بڑی گہری تھی۔ ابھی اُن کی تصنیفی صلاحیتیں اُبھر ہی رہی تھیں کہ مالک الملک کا بلاوا آگیا اور وہ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ زیرِ نظر مضمون اُن کے نوٹس سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے نہ صرف اشتراکیت کے بارے میں صحیح معلومات حاصل ہونگی بلکہ اپنے ایک مخلص رفیقِ کار کی یاد بھی تازہ ہوگی۔ ع۔ح۔ص]

اشتراکیت کے بارہ میں عام طور پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ محض ایک اقتصادی نظام ہے۔ جس کا تعلق انسان کے معاشی مسائل کے علاوہ اور کسی معاملہ سے نہیں ہے۔ اس لیے بعض اوقات سادہ لوح عوام کو دھوکہ دینے کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک معاشرہ کا خواہ کوئی بھی مذہب ہو، کوئی نظامِ اخلاق ہو، کوئی سیاسی ہیئت ہو۔ لیکن اگر وہ اشتراکیت کا تجویز کردہ معاشی نظام اپنا لے تو پھر کمیونزم اس کے سامنے مزید کوئی مطالبہ نہیں رکھتا۔ بلکہ اپنی مادی برکات کے ثمرات سے اس کی جھولی بھر دیتا ہے۔ اس تصور نے بعض عجیب و غریب غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اسلام کو اپنی جگہ علیٰ حالہٖ قائم رکھتے ہوئے اگر صرف مارکس کی پیش کردہ معاشی تجاویز پر عمل پیرا ہو جائیں تو انہیں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی حاصل ہو جائے گی۔ جنتِ ارضی کے وہ

کمیونزم کو اختیار کرنے کی وجہ سے حقدار ہونگے اور فلاحِ آخرت اسلام کی وجہ سے اُن کے حصے میں آئیگی۔ اس طرح دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار ہونگے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ تصورات کا یہ تار و پود خود فریبی پر مبنی ہے یا اُس ذہنی افلاس پر، جو اسلام اور کمیونزم دونوں ہی سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ اس حالت میں بہتر یہ ہوگا کہ خود اشتراکیت کے بانی کارل مارکس کی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے کہ اس کا پیش کردہ کمیونزم کیا ہے؟

مارکس کے کمیونزم کی بنیاد تین اصولوں پر ہے (۱) جدلی مادیت DIALECTICAL MATERIALISM (۲) طبقاتی نزاع (CLASS STRUGGLE) اور (۳) قدر زائد (SURPLUS VALUE) اس باب میں انہیں تینوں اصولوں کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے

۱۔ جدلی مادیت DIALECTICAL MATERIALISM: اس نظریہ کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کی تاریخ۔ اس کی ابتدا اور اس کے آغاز کا جائزہ لیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کیا یہ سب کچھ مارکس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے یا دوسرے لوگوں کی خوشہ چینی۔

جدلیت (DIALECTICS) یونانی لفظ DIALEGO سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بحث کرنا۔ پرانے زمانہ میں کسی شے کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے بحث و تمحیص کا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ ہر صاحبِ علم مخالف کے دلائل کا تضاد واضح کر کے ان کی تردید کرنے کی کوشش کرتا۔ اس دور کے حکماء کا خیال تھا کہ حقیقت کی نقاب کشائی کے لیے خیالات کے تضاد کو نمایاں کر کے مخالف کی غلطی واضح کی جا سکتی ہے[۱]

ہیگل اور کانٹ کے بعد آنے والے دوسرے حکماء نے اس طرزِ جدلیت کو خود فطرت کے کارخانۂ ہست و بود کی حقیقت سمجھنے کے لیے استعمال کیا۔ ان کے نزدیک اِس عالمِ کون و مکان اور تجربہ گاہِ عالم میں شکست و ریخت اور تعمیر و تخریب کا سلسلہ زبانِ حال سے مصروف بحث و جدال ہے۔ خود حقیقت REALITY ہی نے یہ کاروبار جاری کر رکھا ہے۔ اس کا ایک فرقی منطقی دعویٰ۔

۱؎ PROBLIMS OF LENINISM T. STALIN P.570

(LEGAL THESIS) ہے اور دوسرا فریق منطقی جواب دعویٰ (LOGICAL ANTITHESIS) ہے ۔ اس بحث و تمحیص اور کش مکش کے بطن سے ایک ایسی " ناقابلِ فنا حرکت" جنم لیتی ہے ۔ جو ایک بلند " امتزاج " SYNTHESIS کی طرف گامزن ہے ۔ ہیگل کے نزدیک اس جدلی حرکت کی منزلِ مقصود خدا یا روحِ مطلق ہے ۔

ہیگل کا فلسفۂ جدلیت ہیگل کہتا ہے کہ انسانیت کے مختلف ادوار میں تہذیب و تمدن کے جو مختلف مظاہر نظر آتے ہیں یہ سطحِ مدنیت پر خود رو پودوں کی طرح یونہی بغیر کسی منصوبے کے نمودار نہیں ہوتے ۔ بلکہ اپنے زمانہ کی " روحِ عصر " کے نہایت ہی مربوط برگ و بار ہیں جو اپنی اصل سے اسی طرح متعلق ہیں جس طرح کسی درخت کی شاخیں اور پتیاں اس کے تنا سے وابستہ ۔ خود " روحِ عصر " کیا ہے ؟ ہیگل کے نزدیک یہ وہ چراغ ہے جس کی روشنی سے زندگی کے مختلف پہلو منور ہوتے ہیں ۔ یہ وہ تنا ہے جس سے شجرِ تمدن کی مختلف شاخیں نمودار ہوتی ہیں ۔ وہ کہتا ہے کہ ہر تمدن کے مختلف شعبوں کا اس کے اصل سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ نہر اور اس کی شاخوں کا اصل دریا سے ہوتا ہے ۔ دریا میں جس قسم کا پانی ہوتا ہے اس کی مخصوص صفات نہروں کی آخری شاخ تک ہر قطرہ میں نمایاں ہوتی ہیں ۔ معاشرہ میں تصور کی یہی پوزیشن ہے ۔ ہر دور کے معاشرہ میں کوئی نہ کوئی غالب تصور کارفرما ہوتا ہے ۔ اس تصور ہی کی روح ہوتی ہے جو اس وقت کے نظامِ زندگی کے تمام شعبوں میں اسی طرح جاری و ساری ہوتی ہے جس طرح انسانی جسم کی رگوں میں گردشِ خون ۔ چنانچہ زندگی کے تمام شعبوں مثلاً اخلاق ، مذہب ، معیشت و سیاست ۔ معاشرت و تمدن کا ہیولیٰ یہی " روحِ عصر " تیار کرتی ہے ۔ جب یہ غالب تصور اپنے اوجِ کمال تک پہنچ جاتا ہے تو پھر اس " تصور " (IDEA) یا روحِ عصر (SPIRIT OF THE AGE) کے بطن سے ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے جو اپنی حقیقت کے لحاظ سے کارفرما تصور کی عین ضد ہوتا ہے ۔ یہ تصور اس ماحول میں نشو و نما پاتا ہے ۔ اس کے مفید اور بہتر عناصر جذب کرتا ہے اور سن شعور کو پہنچ کر غالب تصور سے پنجہ آزمائی شروع کر دیتا ہے ۔ اس جنگ و جدل میں کارازرفتہ تمدن اپنے وسائل و تجربات کے تمام اسلحہ سے مسلح ہو کر آتا ہے ۔

لیکن نیا "تصور" نئے خون، تازہ جوش اٹھتی ہوئی امنگوں اور ابھرتے ہوئے جذبات کی لہروں اور موجوں کے تھپیڑوں سے پرانے اور فرسودہ نظام کو شکست دیکر پیوندِ خاک کر دیتا ہے۔ اور "روحِ عصر" کا تاج پہن کر اقتدار کے خالی تخت پر قابض ہو جاتا ہے۔ یہ نیا تصور زندگی کے تمام شعبوں میں اسی طرح سرایت کر جاتا ہے جس طرح شکست خوردہ تمدن اپنے وقت میں غالب اور مسلط تھا۔ اس جنگ و جدل، تخریب و تعمیر اور بناؤ بگاڑ کا نام ہیگل کی اصطلاح میں "جدلیت" DIALECTIC P ہے۔ اس کے ہر ادا کار کا اس نے جدا جدا نام رکھا ہے۔ کار فرما "تصور" کو وہ دعویٰ (THESIS) کہتا ہے۔ اس کے بطن سے پیدا ہونے والی اس کی ضد کو وہ جوابِ دعویٰ (ANTI THESIS) کا نام دیتا ہے۔ اور اس جنگ کے بعد غالب آنے والا تصور امتزاج (SYNTHESIS) کہلاتا ہے۔

ہیگل کے نزدیک میدانِ تمدن میں یہ جنگ و جدال اور کشت و خون کسی بخت و اتفاق کی کرشمہ سازی نہیں۔ بلکہ حقیقت میں یہ ایک باشعور طاقت کا مقررہ پروگرام ہے جس کے مطابق یہ سب کچھ انجام پا رہا ہے۔ وہ ہستی کون سی ہستی ہے جو ہماری آنکھوں سے مستور مگر کار فرما ہے۔ ہیگل کہتا ہے وہ خدا ہے۔ وہ روحِ مطلق ہے۔ وہی طاقت اس کارخانۂ ہست و بود کو معرضِ وجود میں لائی۔ وہ ایک مقررہ مقصد، ایک طے شدہ پروگرام اور ایک واضح سکیم کے تحت اس تماشہ گاہِ عالم کو منزلِ مقصود کی طرف لے جا رہی ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے ذہنِ انسانی کو آلۂ کار بنایا ہے اور اسے دعویٰ۔ جوابِ دعویٰ کی کشمکش میں مبتلا کر کے اسے آگے بڑھنے کی ہمت اور توفیق عطا کی۔

کارل مارکس کا نظریہ | ہیگل کے اس فلسفہ سے مارکس نے جدلیت کا نظریہ تو لے لیا لیکن اور دو معاملات میں اختلاف کیا ہے۔ ایک تو ایسی غیبی ہستی کے وجود میں جو نظروں سے اوجھل ہے اور خالقِ ارض و سما کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی خدا۔ اور دوسرے تصور کو مادہ سے ایک علیحدہ وجود سمجھا۔ اس کے برعکس کہتا ہے کہ نہ تو کوئی خدا ہے جس نے زمین وغیرہ کو پیدا کیا ہو اور نہ ہی

"تصور" مادہ سے جدا وجود رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر شے کا اصل مادہ ہی ہے۔ کیوں کہ مادہ ہی جب کمیت کی بجائے کیفیت کے لباس میں جلوہ گر ہوتا ہے تو فکر کہلاتا ہے۔ لہٰذا یہ "فکر" اپنی اصل اور نوعیت کے لحاظ سے غیر مادی نہیں بلکہ مادی ہے۔ اس تشریح کے بعد مارکس جدلیت کے ڈھانچہ سے "تصوریت اور عینیت" کی حقیقت کو نکال کر اس میں "مادیت" کی "روح" بھر دیتا ہے۔ چنانچہ اس "جدلیت" کا نام اس نے جدلی مادیت DIALECTICAL MATERIALISM رکھا ہے۔ خود مارکس کے الفاظ میں سنیے:

"میرا تصورِ جدلیت نہ صرف یہ کہ ہیگل کے تصور سے مختلف ہے۔ بلکہ اس سے بالکل ہی متضاد ہے۔ ہیگل ذہنِ انسانی کی تگ و تاز اور فکر و جستجو کو تصور (IDEAL) کے نام سے موسوم کر کے اسے ایک توحدا گانہ اور مستقل بالذات حیثیت عطا کرتا ہے۔ اور دوسرے اس دنیا کا خالق قرار دیتا ہے۔ اور اس ٹھوس اور حقیقی دنیا کو اسی "تصور" کا پیکرِ محسوس بتاتا ہے۔ میرے نزدیک حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اور وہ یہ کہ (IDEAL) تصور فی نفسہ مادی دنیا کی اس عکاسی کے سوا کچھ نہیں، جو ذہنِ انسانی کے وظیفۂ غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اور جسے اس نے فکر کے قالب میں ڈھالا ہے"[1]

مارکس کا رفیق اینجلز (ENGELS) لکھتا ہے۔

"فطرت کے مادی نظریہ کا مطلب اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اُسے بغیر کسی بیرونی مداخلت کے جوں کا توں تصور کر لیا جائے"[2]

اب مارکس کے شاگردِ رشید لینن کا بیان سنیے جس نے اس فلسفہ کی بنیاد پر ایک انقلاب برپا کیا۔ ماضی کے ایک مفکر ہرقلیط (HERCLITUS) کے مادی نقطۂ نظر کو سراہتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ ہرقلیط نے جدلی مادیت کے بنیادی اصولوں کی نہایت اچھی تشریح کی ہے۔

---

[1] KARL MARX CAPITAL VOL I P.30

[2] STALIN PROBLEMS OF LENINISM P. 79

ہرقلیطس کے جس نظریہ کی تعریف میں لینن اس طرح رطب اللسان ہے وہ یہ ہے :

"دنیا من حیث الکل نہ تو کسی خدا کی تخلیق ہے اور نہ کسی انسان کی، بلکہ ماضی، حال اور مستقبل کی ایک زندہ شعاع ہے۔ جو ایک خاص ضابطہ کے تحت روشن ہوتی ہے اور پھر مدھم پڑ جاتی ہے"

مارکس ہیگل کے اس نظریہ پر کہ کوئی غیر مادی طاقت بھی موجود ہے۔ جو اس کائنات کی علتِ تخلیق ہے، رہ رہ کر اعتراض کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک " ہیگل خواب و خیال کی دنیا میں رہنے والا انسان تھا۔ تصورات کی نوعیت تجریدی نہ تھی بلکہ اس کے برعکس اشیاء اور ان کا نشوونما اس کے خیال میں ایسے خیالات کا پرتو تھا جنہیں عالم محسوسات سے ہی مستعار لیا گیا تھا۔ خود "تصور" بھی اس کے (ہیگل) نزدیک ایک ایسا وجود تھا جو کہیں نہ کہیں دنیا کی تخلیق سے قبل ہی موجود تھا"

پھر لکھتا ہے :

" دنیا کی وحدت کا انحصار اس کے وجود پر موقوف نہیں ہے . . . . بلکہ حقیقی یک جہتی اس کی مادیت کی رہینِ منت ہے . . . فلسفہ اور طبیعیات کی لمبی چوڑی اور اکتا دینے والی بحثیں اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ حرکت مادہ کی ہی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مادہ تو ہو لیکن حرکت کے بغیر۔ یا حرکت تو ہو۔ لیکن مادہ کے بغیر . . . . پھر اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ تصور و شعور کی حقیقت کیا ہے۔ اور یہ کہاں سے آتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بلاشبہ ہے تو ذہنِ انسانی کی ہی پیداوار لیکن خود انسان کی تخلیق فطرت کی رہینِ منت ہے۔ اور وہ مادی دنیا کے اندر ہی نشوونما پاتا ہے۔ لہٰذا یہ واضح رہے کہ ذہنِ انسانی جو کہ بالآخر فطرت ہی کی پیداوار ہے فطرت کے دوسرے مظاہر سے متصادم ہونے کی بجائے اُن سے موافقت رکھتا ہے۔

ان تشریحات سے واضح ہو گیا کہ مارکس کس چیز کی نفی اور کس کا اثبات کرتا ہے۔ وہ ایک تو اس چیز کو ماننے سے انکار کرتا ہے کہ کوئی غیر مرئی ذات یا علیٰ طاقت، خدا وغیرہ موجود ہے۔

جس نے اس کائنات کی تخلیق کی ہو۔ یا جس کے حکم اور منشا سے یہ کارخانۂ قدرت چل رہا ہے۔ دوسرے وہ اس بات سے بھی انکار کرتا ہے کہ "تصور" یا "خیال" جسے ہیگل ایک مستقل بالذات حیثیت عطا کرتا ہے فی الواقع مادہ سے جدا اور علیحدہ ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ اصل حقیقت مادہ ہے۔ کائنات کی تخلیق اسی کی رہینِ منت ہے۔ اسی کی حرکت سے کائنات کے مختلف مظاہر کے درمیان وحدت پیدا ہوتی ہے۔ زمین پر مختلف انواع کی متنوع اشیاء اصل میں مادہ ہی کے لباس کمیت کا مظاہر ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ "خیال"، "تصور"، "شعور" وغیرہ بھی مادہ کے لباس کیفیت کے وظیفۂ فطری کی تخلیق ہیں۔ لہٰذا نہ تو کوئی خدا ہے اور نہ کوئی دوسری غیبی طاقت۔ کائنات کی تخلیق اور جو کچھ اس پر ہے سب مادہ کی ہی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اسی تصورِ کائنات کا نام مارکس نے مادیت رکھا ہے۔

جدلیت اوپر بیان ہو چکا ہے کہ قدیم زمانہ میں اہلِ یونان جدلیت کے ذریعہ متضاد دلائل کی چھان پھٹک اور بحث و تمحیص سے حقیقت کا علم حاصل کرتے تھے۔ ہیگل نے تجربہ گاہِ عالم میں فطرت کی شکست و ریخت اور تخریب و تعمیر کو اسی جدلیت کے طرز پر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ متضاد تصورات و خیالات "بحث و جدال میں الجھے ہوئے حقیقت کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں"۔ مارکس نے جدلیت کا ڈھانچہ تو ہیگل سے مستعار لیا اور اس کے اندر سے عینیت (IDIALISM) کا جوہر نکال کر اس میں مادیت کی روح بھر دی۔ پھر اس مرکب کا نام جدلی مادیت (OBJECTIVE MATERIALISM) رکھا۔ اس سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مظاہرِ فطرت ہر لحظہ تغیر پذیر ہیں۔ فطرت کے اندر مختلف عناصر برسرِ پیکار ہیں۔ ان کی یہ باہمی کشمکش اور فطرت کی تکمیل ان ہی متضاد عناصر کے تعامل کی رہینِ منت ہے۔

لہٰذا اس لحظہ بہ لحظہ تبدیل ہونے والی دنیا میں جدلیت کے نقطۂ نظر سے کوئی چیز ایسی نہیں جو مکمل ہو۔ ہر شے میں سقم ہے۔ ہر بات میں کمی ہے۔ کوئی چیز نہیں جو حرفِ آخر ہو۔ کوئی اصول اور کوئی قدر نہیں جس کے وجود کو مقدس قرار دیا جا سکتا ہو۔ اس فلسفہ کی رو سے

ہر شے اپنی سرشت اور نوعیت کے لحاظ سے وقتی اور عبوری ہے۔ یہاں کسی کو بھی قرار نہیں۔ ہر چیز بدلتی رہتی ہے اور ترقی کی منزل کی طرف گامزن۔

مارکس عینیت (IDIALISM) کے برعکس جو دنیا کو ایک "تصور مطلق" یا "روح عالم" یا "شعور" کا مظہر قرار دیتا ہے مارکسی جدلیت کا نظریہ یہ ہے کہ دنیا کسی تصورِ مطلق یا روح عالم کے تصور یا شعور کے سانچے میں ڈھلا ہوا مادی پیکر نہیں، بلکہ فی نفسہ

(۱) اپنے جوہر، اپنی روح اور حقیقت کے لحاظ سے مادی ہے۔

(۲) اس کے بے شمار مظاہر اصل میں مادہ کی حرکت ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔

(۳) ان مختلف مظاہر کا آپس میں ربط اور ایک دوسرے پر انحصار مادہ کے ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ جس کے مطابق دنیا ارتقاء کی منزلیں طے کر رہی ہے لہٰذا یہ کسی روحِ مطلق کی محتاج نہیں ہے"

تاریخ کا مادی نظریہ | مارکس کا یہ نظریہ تو بیان کیا جا چکا ہے کہ مختلف مظاہر فطرت کا آپس میں ربط و ضبط اور ایک دوسرے پر انحصار دراصل کتابِ ارتقاء کے وہ قواعد اور روداد سفر کے وہ ضوابط ہیں جن کے تحت متحرک مادہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھانے سرگرم عمل رہتا ہے۔ یہ ضوابط کیا ہیں؟ کیا ان کا اطلاق معاشرتی معاملات پر بھی ہو سکتا ہے؟ اگر ہوتا ہے تو کیسے اور کس طرح؟ اس کے نتائج کیا ہیں؟ وغیرہ۔ وغیرہ۔ مارکس کہتا ہے ان معاملات کا اگر جدلی مادیت کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح مظاہر فطرت کا ایک دوسرے سے رشتہ و تعلق اور ایک دوسرے پر انحصار مادی قوانین کی غمازی کرتا ہے بعینہ تمدنی معاملات میں معاشرتی تعلقات کا سلسلہ اور ربط و ضبط بھی معاشرتی قوانین کی نشاندہی کرتے ہیں۔

شاٹن اس کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہے:

"جب مظاہر فطرت کے درمیان ربط و ضبط اور ان کا آپس میں ایک دوسرے پر انحصار ارتقائے فطرت کا ضابطہ ہے تو اس سے خود بخود یہ مطلب بھی اخذ ہو جاتا ہے کہ معاشرتی زندگی

میں رنگا رنگ مظاہر کا باہمی تعلق بھی تمدنی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ جب معاشرتی زندگی کے مظاہر کا آپس میں تعلق اور ایک دوسرے سے ربط سوسائٹی کے ارتقاء قانون کا مظہر ہے۔ اس قانون کے تحت جب تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو تاریخ "حادثات" و "اتفاقات" کے ایک دفتر بے معنی کی بجائے سوسائٹی کے تدریجی ارتقاء کا سفرنامہ بن جاتی ہے۔ جس کا مطالعہ فی نفسہ ایک علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر یہ علم اتنا ہی درست اور صحیح ہوتا ہے جتنا کہ دوسرے علوم۔ اس کے قوانین سے معاشرتی حالات کے سمجھنے میں کافی حد تک مدد ملتی ہے، بلکہ یہ وہ کلید ہے جس سے تاریخ کے متعلق باب کھل جاتے ہیں لہٰذا دنیا میں تعمیر و تخریب کا جو کھیل کھیلا جا رہا ہے، اقدارِ حیات میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں، فکر و نظر کے زاویے جس طرح بدل رہے ہیں، زندگی کے مختلف نظاموں میں شکست و ریخت کا جو سلسلہ جاری ہے وہ سب ان ہی اصولوں کے مطابق ہو رہا ہے۔ ان قوانین کی روشنی میں تاریخ کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ معاشرتی انقلابات جن کو تاریخ والوں نے کسی وقتی ہنگامہ، عارضی جذبات، کسی انقلابی شخصیت کے انقلابی نظریات کا مرہونِ منت قرار دیا ہے۔ دراصل معاشرتی انقلابات کے مقررہ سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں جو (۱) نہ تو کسی خاص شخص کے نظریات، خدائی ہدایت، کسی غیبی مقتدر اعلیٰ کی تعلیم کا نتیجہ ہیں۔ (۲) نہ ہی وقتی حالات، ہنگامی جذبات کے آتش فشاں سے پھوٹنے والا لاوا ہے۔ اور (۳) نہ نسلی و خاندانی، قومی، شخصی و ملی جھگڑوں کے خونی نتائج بلکہ اپنے اپنے وقت کے معاشرتی تعلقات سے پیدا ہونے والے ثمرات ہیں۔ کیونکہ اصل تو معاشی تعلقات ہی ہوتے ہیں جو کسی دور کے افکار و نظریات کو جنم دیتے ہیں۔ لہٰذا کسی انقلاب کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے ان معاشی اصولوں ہی کا کھوج لگانا پڑے گا۔ سٹالن اس نظریہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"اگر فطرت، وجود اور مادی دنیا کی حیثیت متقدم ہے۔ اور ذہن و خیال کا مقام ثانوی اگر مادی دنیا کا وجود خارجی (OBJECTIVE) ہے۔ اور انسانی ذہن سے جدا اس معروضی (OBJECTIVE) حقیقت کا عکس، تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ معاشرہ کی مادی زندگی

اور اس کا وجود بھی مقدم اور اس کی روحانی زندگی ثانوی۔ نیز معاشرہ کی مادی زندگی انسانی ارادہ سے آزاد ایک خارجی حقیقت ہے تو معاشرہ کی روحانی زندگی اس معروضی حقیقت کا عکس اور اس کے وجود کا پرتو ہے۔"

لہٰذا معاشرہ کی روحانی زندگی کی تشکیل کا منبع اور معاشرتی خیالات، نظریات، سیاسی تصورات اور اداروں کا سرچشمہ فی نفسہٖ ان خیالات، نظریات، تصورات اور سیاسی اداروں میں نہ تلاش کیا جاتے بلکہ معاشرہ کی مادی زندگی کے حالات اور اس کے معاشرتی وجود میں ڈھونڈا جائے۔ کیونکہ یہ خیالات، تصورات، نظریات اور ادارے وغیرہ۔ ان (معاشرہ کی معاشی زندگی کے حالات اور اس کے معاشرتی وجود) ہی کا پرتو ہیں۔"

اگر تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف معاشرتی خیالات، نظریات، تصورات، اور سیاسی اداروں کو سمجھنا مقصود ہے . . . . تو ان کا حقیقی علم خود ان خیالات، نظریات، تصورات اور سیاسی اداروں کی "نوعیت" اور "خصوصیت" سے معلوم نہیں ہو گا۔ بلکہ تمدنی ارتقاء کے مختلف ادوار کی مادی زندگی کے مطالعہ سے حاصل ہو گا۔"

پھر آخر میں لکھتا ہے: "سوسائٹی کے افراد کے مابین جس قسم کا معاشی تعلق قائم ہو گا اسی تعلق کے تحت مختلف افکار و نظریات پرورش پائیں گے۔"

اسی نظریہ کی بنا پر مارکس کا دعویٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں جب بھی انقلابات آئے تو ان کی اصل وجہ وسائل پیداوار اور مادی حالات کی تبدیلیوں میں تھی۔ چنانچہ تاریخ کے جن انقلابات کی وجہ مذہبی آویزش، خاندانی سر پھٹول، نسلی تعصبات، فلسفیانہ نظریات یا تصورات کی ادھیڑ بن، قوم و وطن یا رنگ و نسل کے اختلافات قرار دی گئی ہے۔ اور بظاہر ان انقلابات پر یہی لیبل چسپاں نظر آتے ہیں۔ اور تاریخ کے صفحات میں ان ہی ناموں کے تحت وجود پذیر ہوئے۔ حقیقتاً ان وجوہات کے نتیجہ میں ظہور پذیر نہیں ہوئے۔ بلکہ ان کا منبع و مخزن معاشی تبدیلیوں کا وجود ہی ہوتا ہے۔ یہ معاشی تبدیلیاں انسان کے بس کا روگ نہیں۔ یہ خود بخود معرض وجود میں آتی

رہتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی حیثیت سیلِ بے پناہ میں خس و خاشاک کی سی ہے جسے معاشی تعلقات کا دھارا جس طرف چاہتا ہے بہا کر لے جاتا ہے۔

مارکس نے ایک خط میں انسان کی بے بسی اور بے چارگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے دو سوالات اٹھائے۔ پہلا تو یہ کہ ایک معاشرہ فی نفسہٖ کیا ہوتا ہے۔ اس کا جواب وہ یہ دیتا ہے کہ افراد کے آپس میں ایک دوسرے سے تعلقات کا نام معاشرہ ہے۔ جس نوعیت کے تعلقات ہوں گے اُسی نوع کا معاشرہ ہوگا۔ دوسرا سوال وہ یہ کرتا ہے کہ کیا افراد اپنے تعلقات کی نوعیت تبدیل کرنے میں خود مختار ہیں؟ مارکس اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ "ہرگز نہیں"۔ وہ کہتا ہے کہ افراد کے تعلقات کا دارومدار چونکہ اُس وقت کی پیداواری قوتوں کی نوعیت پر منحصر ہوتا ہے اور پیداواری قوتوں کی تخلیق میں ایک معاشرہ آزاد نہیں ہوتا۔ انسان جس معاشرہ میں آنکھ کھولتا ہے وہ اپنے آپ کو ایک خاص طرز کے معاشی تعلقات میں بندھا ہُوا پاتا ہے جس سے اُسے کوئی مفر نہیں۔ اب ہر نئی پیداواری طاقت جسے انسان معرضِ وجود میں لانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس کے پاس خام مواد صرف وہی پیداواری قوتیں ہیں جو اُس کے پیش رو اس کو عطا کر گئے ہیں۔ لہٰذا وہ اس پر مجبور ہے کہ نئی پیداوار کے لیے اُسی موادِ خام ہی کو استعمال کرے۔ ظاہر بات ہے کہ جس قسم کا خام مال ہوگا اُسی طرز کی پیداواری قوت معرضِ وجود میں آئیں گی۔ اور جس قسم کی پیداواری قوتیں ہوں گی۔ اُسی نوع کے انسانی تعلقات قائم ہوں گے۔ اور جس قسم کے انسانی تعلقات اُبھریں گے اُسی طرز کا معاشرہ قائم ہوگا۔ لہٰذا انسان معاشرہ کے انتخاب میں آزاد نہیں۔ بلکہ مادی جکڑبندیوں میں بُری طرح بندھا ہُوا ہے۔

رسائل و مسائل

اجتہاد کے حدود

سوال:- میرے ایک جرمن نومسلم دوست ہیں جن سے میرا رابطہ مراسلت قائم ہے۔ وہ مجھ سے اپنے بعض علمی و عملی اشکالات بیان کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ان کا ایک خط آیا ہے جس میں انہوں نے دریافت کیا ہے کہ فقہی احکام میں "اجتہاد" کے اصول کے تحت کہاں تک تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اسلام کے بہت سے تفصیلی احکام فقہا کے اخذ کردہ اور مرتب کردہ ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بعض خاص جغرافیائی اور تمدنی حالات کی پیداوار ہیں۔ کئی صدیوں تک تو اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا گیا تھا مگر اس کے بعد اصولاً ضرورت اجتہاد کو تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اسے بند کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل کے زمانے میں بالخصوص یورپ کے مسلمانوں کو بعض احکام کی تعمیل میں دشواری پیش آتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ وضو کے مسئلے کو لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وضو میں ہر مرتبہ پاؤں دھونا اہلِ یورپ کو مشکل اور غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہاں لوگ ہمیشہ جراب اور بند جوتے استعمال کرتے ہیں، اس لیے پاؤں کے گرد آلود یا ناپاک ہونے کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ سردیوں میں پاؤں دھونا آسان بھی نہیں ہوتا یہی معاملہ منہ دھونے کا ہے۔ یورپ کے شہروں میں بالعموم مٹی نہیں اڑتی اور پسینہ بھی برائے نام آتا ہے اس لیے ان کے نزدیک منہ اور پاؤں کا دن میں ایک مرتبہ دھونا کافی ہونا چاہیے۔

آپ براہِ کرم میرے دوست کے خیالات پر صحیح اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کریں اور اس کا جو پہلو اصلاح طلب ہو، واضح فرمائیں تاکہ میں انہیں اطمینان بخش جواب دے سکوں۔

جواب ۔ آپ کے جرمن دوست نے اپنے سوالات کا آغاز تو اس بات سے کیا ہے کہ فقہاء کے بیان کردہ احکام میں حالات کے لحاظ سے کہاں تک ترمیم کی جا سکتی ہے، لیکن آگے چل کر جہاں وہ ایک متعین مثال پیش کرتے ہیں وہاں فقہاء کے بیان کردہ احکام میں نہیں بلکہ خود قرآن کی نصوص میں ترمیم کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ وضو میں منہ، کہنیوں تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھونے اور سر پر مسح کرنے کا حکم تو قرآن میں دیا گیا ہے (المائدہ آیت ۶)

پھر منہ اور پاؤں دھونے کے حکم کی جو وجہ آپ کے دوست نے سمجھی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ حکم محض گرد صاف کرنے کے لیے دیا گیا ہے اور جہاں گرد و غبار نہ ہو وہاں اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالانکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے ہی نہیں۔ دراصل اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اس کی عبادت کے قابل ہونے اور قابل نہ ہونے کی حالت کے درمیان فرق کیا جائے تاکہ آدمی جب اس کی عبادت کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اپنے جسم اور لباس کا جائزہ لے کر دیکھے کہ آیا میں خدا کے حضور حاضر ہونے کے قابل ہوں یا نہیں، اور جانے سے پہلے اپنے آپ کو پاک صاف کر کے اہتمام کے ساتھ جائے۔ اس طرح عبادت کی اہمیت دل میں جاگزین ہوتی ہے اور آدمی اسے اپنے عام معمولی کاموں سے ایک مختلف اور بالاتر نوعیت کا کام سمجھ کر بجا لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں پانی نہ ملے وہاں تیمم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حالانکہ تیمم سے بظاہر کوئی صفائی بھی نہیں ہوتی۔

علاوہ بریں وضو میں جس صفائی کا حکم دیا گیا ہے اس سے ایک ضمنی مقصد یہ بھی ہے کہ پنج وقتہ نماز کی وجہ سے آدمی کو پاک رہنے کی عادت پڑ جائے۔ گندگی لازماً صرف مٹی اور گرد و غبار کی وجہ سے ہی نہیں ہوتی۔ آدمی کے مسامات سے ہر وقت کچھ نہ کچھ فضلات خارج ہوتے

رہتے ہیں۔ اگر انہیں دھویا نہ جاتا رہے تو یہ مادے جسم کی سطح پر جم جم کر بُو پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صاحب لوگوں کے منہ سے بھی بُو آتی ہے، ان کے بدن میں بھی ایک طرح کی سڑاند ہوتی ہے اور ان کے پاؤں تو سخت بدبودار ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان کے جوتوں اور جرابوں میں بھی تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے پیرو کسی حیثیت سے بھی نفرت انگیز حالت میں رہیں۔ یورپ کے لوگ اس بدبو کو دبانے کے لیے عطریات اور لونڈر استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ بدبو کو اوپری خوشبوؤں سے دبانا کوئی پاکیزگی و طہارت نہیں ہے۔

جاڑے کے زمانے میں یا سرد علاقوں میں پاؤں دھونے کی زحمت سے بچانے کے لیے شریعت نے پہلے ہی یہ آسانی رکھ دی ہے کہ آدمی ایک دفعہ وضو میں پاؤں دھونے کے بعد موزے پہن لے۔ پھر ۲۴ گھنٹے تک مقیم کے لیے اور ۷۲ گھنٹے تک مسافر کے لیے پاؤں دھونے کی حاجت نہیں ہے بشرطیکہ اس دوران میں وہ موزے نہ اتارے۔

ان جرمن دوست کو کہیے کہ حالات و ضروریات کے لحاظ سے اسلام کے فروعی احکام میں ضروری ردوبدل تو ہو سکتا ہے، لیکن اس طرح کا ردوبدل کرنے کے لیے شریعت کی گہری واقفیت درکار ہے۔ ہر شخص کو سطحی طور پر یہ اختیارات نہیں دیئے جا سکتے۔

بیمہ کا جواز و عدم جواز

سوال۔ انشورنس کے مسئلے میں مجھے تردد لاحق ہے، اور یہ صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آ سکا کہ آیا بیمہ کرانا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے یا ناجائز؟ اگر بیمے کا موجودہ کاروبار ناجائز ہو، تو پھر اسے جائز بنانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اگر موجودہ حالات میں ہم اسے ترک کر دیں تو اس کے نتیجے میں معاشرے کے افراد بہت سے فوائد سے محروم ہو جائیں گے۔ دنیا بھر میں یہ کاروبار جاری ہے۔ ہر قوم وسیع پیمانے

پر انشورنس کی تنظیم کر چکی ہے اور اس سے مستفید ہو رہی ہے مگر ہمارے ہاں ابھی تک اس بارے میں تامل اور تذبذب پایا جاتا ہے۔ آپ اگر اس معاملے میں صحیح صورت تک رہنمائی کریں تو ممنون ہوں گا۔

جواب۔ انشورنس کے بارے میں شرع اسلامی کی رُو سے تین اصولی اعتراضات ہیں جن کی بنا پر اسے جائز نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔

اوّل یہ کہ انشورنس کمپنیاں جو روپیہ پریمیم (PREMIUM) کی شکل میں وصول کرتی ہیں اس کے بہت بڑے حصے کو سودی کاموں میں لگا کر فائدہ حاصل کرتی ہیں اور اس ناجائز کاروبار میں وہ لوگ آپ سے آپ حصہ دار بن جاتے ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں اپنے آپ کو یا اپنی کسی چیز کو ان کے پاس انشور کراتے ہیں۔

دوم یہ کہ موت یا حوادث یا نقصان کی صورت میں جو رقم دینے کی ذمہ داری یہ کمپنیاں اپنے ذمہ لیتی ہیں اس کے اندر قمار کا اصول پایا جاتا ہے۔

سوم یہ کہ ایک آدمی کے مر جانے کی صورت میں جو رقم ادا کی جاتی ہے، اسلامی شریعت کی رُو سے اس کی حیثیت مرنے والے کے ترکے کی ہے جسے شرعی وارثوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ مگر یہ رقم ترکے کی حیثیت میں تقسیم نہیں کی جاتی بلکہ اس شخص یا ان اشخاص کو مل جاتی ہے جن کے لیے پالیسی ہولڈر نے وصیت کی ہو۔ حالانکہ وارث کے حق میں شرعاً وصیت ہی نہیں کی جا سکتی۔

رہا یہ سوال کہ انشورنس کے کاروبار کو اسلامی اصول پر کس طرح چلایا جا سکتا ہے تو اس کا جواب اتنا آسان نہیں ہے جتنا یہ سوال آسان ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ماہرین کی ایک مجلس جو اسلامی اصول کو بھی جانتی ہو اور انشورنس کے معاملات کو بھی سمجھتی ہو، اس پورے مسئلے کا جائزہ لے اور انشورنس کے کاروبار میں ایسی اصلاحات تجویز کرے جن سے یہ کاروبار چل بھی سکتا ہو اور شریعت کے اصولوں کی خلاف ورزی بھی نہ ہو۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہمیں کم از کم یہ تسلیم تو کرنا چاہیے کہ ہم ایک غلط کام کر رہے ہیں۔ غلطی کا احساس بھی اگر ہم میں باقی نہ

رہے تو پھر اصلاح کی کوشش کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔

بے شک موجودہ زمانے میں انشورنس کی بڑی اہمیت ہے اور ساری دنیا میں اس کا چلن ہے۔ مگر نہ اس دلیل سے کوئی حرام چیز حلال ہو سکتی ہے اور نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ سب حلال ہے یا اسے اس بنا پر حلال ہونا چاہیے کہ دنیا میں اس کا چلن ہو گیا ہے۔ ایک مسلمان قوم ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم جائز و ناجائز میں فرق کریں اور اپنے معاملات کو جائز طریقوں سے چلانے پر اصرار کریں۔

مطبوعات

الرسالہ بزبان انگریزی تالیف : حضرت امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ۔ مرتب و مترجم : ڈاکٹر طفیل آئی سیمان صاحب ایم، اے، پی، ایچ، ڈی۔ شائع کردہ : شیخ محمد اشرف صاحب کشمیری بازار لاہور۔

حضرت امام شافعیؒ کی شخصیت دنیائے اسلام میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اسلامی فقہ کی ترتیب و تدوین میں امام صاحب نے جو قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں اُن کے بارِ گراں سے امتِ مسلمہ کبھی بھی سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ امام موصوف کے ارشادات ایک ایسا بیش قیمت علمی ترکہ ہے جس پر ملتِ بیضانے ہمیشہ بجا طور پر فخر محسوس کیا ہے اور ان کے اندازِ فکر سے رہنمائی حاصل کی ہے۔ زیرِ نظر کتاب "الرسالہ" امام صاحب کے چند بنیادی افکار کا قیمتی مجموعہ ہے۔ فاضل مترجم نے کتاب میں "الرسالہ" کے اُن حصوں کا ترجمہ پیش کیا ہے جو ناسخ و منسوخ کی بحثوں پر مشتمل ہیں اور کتاب کے باقی مباحث کو بڑے اختصار کے ساتھ مقدمہ میں درج کر دیا ہے۔

امام صاحبؒ کے یوں تو سارے افکار و تصورات ہی بنیادی اہمیت کے حامل ہیں لیکن خاص طور پر ان میں "عقیدہ ختم نبوت" اور اسلام میں سنت نبوی کی حیثیت پر بڑے ایمان افروز حقائق پر مشتمل ہیں:۔

"ایک مومن کو سنتِ نبوی کی بھی اُس جذبہ کے ساتھ پیروی کرنی چاہیے جس جذبہ کے ساتھ کہ وہ کتاب الٰہی کی پیروی کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب و حکمت دونوں سے نوازا ہے . . . . اس سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ حکمت سے مراد سنتِ نبوی ہی ہے۔ اس بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے

جو حکم دیا ہے اُس کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عین فرض ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اس بات کا حکم صادر فرمایا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی خدا کی اطاعت ہے اور آپ سے رُوگردانی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے" (ص ۲۴-۲۵)

اس کتاب کے مطالعہ کے وقت دو ایک چیزیں ایسی کھٹکتی ہیں جن کی اگر آئندہ ایڈیشن میں اصلاح ہو جائے تو بہت بہتر ہوگا۔ ایک تو امام صاحب کے افکار و نظریات کو اتنے اختصار سے پیش کیا گیا ہے کہ ان کا مجموعی تاثر کافی کمزور رہتا ہے۔ پھر اُن کے درمیان اُس معنوی ربط کو بھی قائم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی جو اس قسم کی عالمانہ تحریروں کی جان ہوتا ہے۔ کتاب کے مرتب اور مترجم ایک فاضل آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن انہوں نے آغاز میں ایک سرسری سا مقدمہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے جس کو پڑھنے کے بعد ایک قاری تشنگی محسوس کرتا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے الرسالہ کی علمی حیثیت پر صرف شاکر صاحب اور رازی صاحب کی دو آراء درج کر دی ہیں۔ انہوں نے یہ بحث اٹھائی ہے کہ بعض اہلِ علم اس کتاب کو امام شافعیؒ کی تصنیف ماننے سے انکار کرتے ہیں لیکن اس کے حق میں، یا اس کے خلاف انہوں نے کوئی دلیل پیش نہیں کی اور جس رسمی انداز سے اس بحث کو چند فقروں میں سمیٹا ہے وہ ان کے بلند علمی مرتبہ کے شایانِ شان معلوم نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر یہ فقرہ ملاحظہ فرمائیں:

"جہاں ایک طرف ہمیں ایک ایسی روایت ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ امام صاحب کی تصنیف نہیں وہاں ہمیں اس کے برعکس بھی بیسیوں روایات مل جاتی ہیں" (ص ۹)

اس اندازِ بیان کو کسی طرح تحقیقی نہیں کہا جا سکتا۔ پھر بعض مقامات پر اس انداز سے ترجمہ کیا گیا ہے کہ مطلب اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً یہ:

"حدیث کی صحت اُس وقت ہمیشہ محلِ نظر ہوتی ہے جب اُس کے رواۃ کی تعداد معقول حد سے تجاوز کر جائے" (ص ۲۹)

ان چند چیزوں کے باوجود جن کی حیثیت محض گزارشات کی ہے، کتاب بڑی قابلِ قدر ہے اور اس کے ایک ایک حرف سے ہمارے اسلاف کی علمی ثقاہت جھلکتی ہے۔

شیخ صاحب نے اس کتاب کو اپنے روایتی اونچے معیار کے مطابق طبع کرایا ہے۔ کتاب کے صفحات ۹۶ ہیں اور قیمت ۵ روپے جو زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

اقبال کا نظریۂ اخلاق تالیف پروفیسر سعید احمد رفیق، ایم، اے گورنمنٹ کالج کوئٹہ۔ شائع کردہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔ صفحات ۴۲۱۔ قیمت چار روپے۔

زندگی میں اخلاق کی ضرورت اور اہمیت سے کوئی ہوشمند انسان صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔ اخلاق دراصل اُن اصولوں اور ضابطوں کا نام ہے جن کے مطابق انسانی افعال و اعمال پر نیک و بد، محمود و مذموم کا حکم لگایا جا سکتا ہے اور اُن کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔

پروفیسر سعید احمد رفیق صاحب نے اپنی کتاب میں اخلاقی اصول و نظریات پر کافی سیر حاصل اور مفید بحث کی ہے لیکن بیجا نہ ہوگا اگر ہم اس سلسلہ میں ان کی خدمت میں چند گزارشات پیش کریں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے اقبال کی طرف سے اخلاقی قدر اعلیٰ "خودی" کو قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ فیصلہ علامہ اقبال مرحوم کے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔ اقبال کے نزدیک ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے منزلِ مقصود "خودی" یا "انا" نہیں بلکہ رضائے الٰہی ہے۔ "استحکامِ خودی" یا "ارتقائے خودی" قربِ الٰہی کا صرف ایک ذریعہ ہے، مقصد نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ناپختہ خودی اور خام قسم کا انا خدا تک رسائی نہیں حاصل کر سکتا اور نہ خلافت فی الارض کے تمام فرائض بوجوہ احسن ادا کر سکتا ہے۔ فاضل مصنف نے ہر جگہ خودی کو ہی علامہ مرحوم کا منتہائے مقصود بنایا ہے۔ افسوس ہے کہ جس چیز کو اقبال مرحوم نے ذریعہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اُسے پروفیسر صاحب نے اصل منزل سمجھ لیا ہے۔ فاضل مصنف پیش لفظ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"انہوں نے (علامہؒ نے) اخلاقی معیار کو ایک ام الفضائل کی شکل میں پیش کیا ہے۔"

دوسرے مقام پر وہ رقمطراز ہیں :

"اقبال خودی کے استحکام کو مقصد بالذات مانتے ہیں نہ صرف مقصد بالذات بلکہ وہ مقصد اعلیٰ کہ تمام دوسرے مقاصد اور اقدار اس مقصود کو حاصل کرنے کے صرف ذرائع ہیں۔"

ان دونوں باتوں میں کافی تضاد نظر آتا ہے۔ ایک جگہ پروفیسر صاحب اخلاقی معیار کو ام الفضائل قرار دیتے ہیں اور دوسری جگہ وہ خودی کے استحکام یا خودی کو ام الفضائل کا درجہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے یا تو دوسری تحریر لکھتے وقت اپنی پہلی تحریر اُن کے ذہن سے اوجھل ہو گئی ہے یا وہ خودی کو اور اخلاقی معیار کو بالکل ہم معنی الفاظ خیال کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک چیز بھی علامہ مرحوم کے نزدیک ام الفضائل نہیں بلکہ خدا کی خوشنودی اور اُس کے رسول کی اطاعت اور اس سے محبت ام الفضائل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ خودی کو اس لیے مستحکم کرنا چاہتے ہیں کہ اعلائے کلمۃ الحق کے کام آسکے، ملّی استحکام کا باعث بنے اور اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا ذریعہ ثابت ہو سکے۔

دوسری چیز جس کی اس کتاب میں کمی محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ فاضل مصنف نے اخلاق کے مختلف نظریات پر خوب دل کھول کر بحث کی ہے۔ فلسفۂ اخلاق کے بہت سے حکماء کے نام گنائے ہیں۔ ان کے نظریات کی تشریح بھی کی ہے۔ پھر فلسفۂ اخلاق کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ سارا حصہ بڑا قابلِ قدر ہے اور مصنف کی محنت اور وسعتِ مطالعہ کا پوری طرح آئینہ دار لیکن ذہن میں یہ سوال بار بار اُبھر کر آتا ہے کہ کیا ان مغربی مفکرین کے علاوہ جن کا ذکر بصد احترام کیا گیا ہے، ہمیں اس میدان میں مشرق سے قطعاً کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔ کیا ہمارے ہاں کوئی حکیم "دانائے راز" ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے اس موضوع پر کوئی قابلِ قدر بات کی ہو۔ امتِ مسلمہ کی تاریخ کے ساتھ یہ ایک بہت بڑی ناانصافی ہے۔

پھر فاضل مصنف نے اخلاق کے اُن سارے نظریات پر بحث کی ہے جو ہمیں مغرب کے

ہاں ملتے ہیں لیکن انہوں نے اخلاق کے اضافی نظریہ کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اخلاق پر کوئی بحث اس نظریہ پر گفتگو کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس نظریہ نے تو مشرق اور مغرب کے اخلاق کو سب سے زیادہ تہ و بالا کیا ہے اور آج بھی اس کی تباہ کاریاں کچھ کم نہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اضافیت اسلامی تعلیمات سے کہیں میل نہیں کھاتی۔ اسلام نے اخلاق کے ایسے پائیدار بنیادی اصول دیئے ہیں جو زمان و مکان کی تبدیلیوں کے ساتھ متغیر نہیں ہوتے اور جیسا کہ فاضل مصنف نے خود اعتراف کیا ہے علامہ اقبالؒ کی بنیاد قرآنی اصولوں پر ہے۔ ایسی صورت میں اسلامی اخلاقیات اور نظریۂ اضافیت کا موازنہ بہت ضروری تھا۔

یہ چند گزارشات ہیں جنہیں ہم فاضل مصنف کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں ہمیں ان کی حق پسند طبیعت سے پوری توقع ہے کہ وہ ان پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے اور آئندہ اڈیشن شائع کرنے سے پیشتر ان میں مناسب تبدیلیاں کر دیں گے۔



دین کی خدمت کرنے والوں کیلئے ایک خصوصی رعایتی پیشکش

ہماری مختلف مطبوعات ایک عرصہ سے تبلیغی مقاصد کے لیے استعمال کی جا رہی ہیں۔ یہ اپنے مقصد میں جس حد تک کامیاب ہیں اس سے آپ بخوبی واقف ہیں تبلیغی مقاصد کو بطور احسن انجام دینے کے لیے ہم نے اپنی چند چیدہ چیدہ کتب کا ایک سٹ بنایا ہے تاکہ جو حضرات بندگانِ خدا تک اسلام کی دعوت پہنچانا چاہتے ہیں ان کو ایسی تبلیغی کتابوں کا ایک ایسا جامع مجموعہ مل جائے جو ہلکا پھلکا اور کم قیمت ہو اور دعوتِ اسلام کے متعدد پہلوؤں پر حاوی بھی۔ ان سب باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے حسبِ ذیل (بیس ۲۰) کتب پر مشتمل ایک سٹ بنایا گیا ہے:

۱۔ توحید و رسالت اور زندگی بعد موت کا عقلی ثبوت	۱—۱۲	۱۱۔ اسلام کا نظامِ حیات	۱—۰۰
۲۔ سلامتی کا راستہ	۰۰—۷۸	۱۲۔ نیا نظامِ تعلیم	۰۰—۳۷
۳۔ اسلام اور جاہلیت	۰۰—۸۷	۱۳۔ اسلامی نظامِ تعلیم	۰۰—۶۲
۴۔ دینِ حق	۰۰—۸۷	۱۴۔ انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۰۰—۶۲
۵۔ اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۰۰—۸۷	۱۵۔ بیمۂ زندگی	۰۰—۵۰
۶۔ تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	۱—۱۲	۱۶۔ مسئلہ قربانی	۰۰—۵۰
۷۔ بناؤ اور بگاڑ	۰۰—۵۰	۱۷۔ اسلام کا نظریہ سیاسی	۰۰—۶۲
۸۔ جہاد فی سبیل اللہ	۰۰—۴۱	۱۸۔ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟	۰۰—۵۵
۹۔ شہادتِ حق	۰۰—۶۲	۱۹۔ اپنی اصلاح آپ	۰۰—۴۱
مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل	۰۰—۸۷	۲۰۔ ہدایات	۰۰—۷۸

ان سب کتابوں کی مجموعی قیمت ۱۴ روپے ہوتی ہے لیکن ہم نے طے کیا ہے کہ رعایتی طور پر:

۱۔ اگر آپ ایک پورا سٹ خریدیں تو ۱۴ روپے کی بجائے ۱۱ روپے قیمت لی جائے گی۔

۲۔ اگر آپ ۵ سٹ مکمل خریدیں تو ۷۰ روپے کی بجائے صرف ۵۰ روپے میں مہیا کریں گے۔

۳۔ ڈاک خرچ و پیکنگ بذمہ خریدار ہوگا۔

ہمیں امید ہے کہ آپ نہ صرف خود اس رعایتی پیشکش سے فائدہ اٹھائیں گے بلکہ اپنے احباب کو بھی آمادہ کریں گے کہ اس موقع پر اس رعایتی پیش کش سے فائدہ اٹھائیں۔